شبنم قیوم

طویل، مختصر افسانے

ایک زخم اور سہی

میزان پبلشرز

طویل، مختصر افسانے

ایک زخم اور سہی

شبنم قیوم

ISBN -978-93-80691-94-7

عنوان : ایک زخم اور سہی (طویل و مختصر افسانے)

مصنف : شبنم قیوم

صفحات : 199

قیمت : 300 روپے

ٹائپ سیٹنگ : مسرت جان

طباعت : میزان سروسز

سال اشاعت : پہلا ایڈیشن 1970 جدید ایڈیشن جون 2015

ناشر

میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹربیوٹرس

اپوزٹ فائیر اینڈ ایمرجنسی سروس بٹہ مالو سرینگر

Ph: 2470851 FAX 0194-245215 Cell: 0941900212

email:meezanpublishers@rediffmail.com

انتساب

ماضی کے ان ادبی شہسواروں
ان عظیم شخصیات کے نام
جس کا متبادل نہ حال میں
ملتا ہے اور نہ مستقبل میں
ملنے کی امید ہے اب نہ وہ
ادیب دیکھنے کو ملتے ہیں اور
نہ ہی وہ ادب!

شبنم قیوم

ماضی یعنی سن ساٹھ کی دہائی کے چند طویل افسانے

۱) دُکھتی آنکھیں

(ہندی اور پنجابی میں ترجمہ ہوا)

۲) جہاں انسان دفن ہے

(ہندی، پنجابی، انگریزی، روسی زبان میں ترجمہ ہوا)

۳) دسہرہ کی سیتا

(ہندی، پنجابی، مراٹھی اور تامل میں ترجمہ ہوا)

۴) دیوی دیوتا

(ہندی، پنجابی، انگریزی اور مراٹھی میں ترجمہ ہوا)

۵) خون، آگ اور دھواں

(انگریزی اور ہندی میں ترجمہ ہوا)

دکھتی آنکھیں اور جہاں انسان دفن ہے
ان کا ڈرامائی روپ بھی دیا گیا

پیش لفظ

آج ایک طویل عرصے کے بعد میں ایک طرح سے دوبارہ ادبی میدان میں اُتر آرہا ہوں۔ ویسے دو سال قبل میں ایک افسانوی مجموعہ ''نشانات'' کے نام سے منظر عام پر لا چکا ہوں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ادبی دنیا میں داخل ہونے کا نیا سفر دو سال قبل شروع کیا، ''نشانات'' کے لگ بھگ سبھی افسانے مطبوعہ ہیں۔ جو سن ۱۹۵۰ء سے لیکر ۱۹۷۰ء تک ملک اور بیرونی ممالک کے ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ ادبی اثاثہ جو نہایت ہی مختصر ہے میری ذاتی لاپرواہی سے بچ گیا۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میرا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ادبی سرمایہ لگ بھگ ضائع ہو چکا ہے۔ جو کہ دوسو دس مطبوعہ افسانوں پر مشتمل ہے۔

اس کی بڑی وجہ میں اپنی ذاتی لاپرواہی مانتا ہوں، ایسی لاپرواہی جس کا ازالہ بھی نہیں ہو سکے گا، ہوا یہ کہ میں بوچھوارہ ڈلگیٹ کے آبائی مکان میں سکونت اختیار کر رہا تھا۔ اکتوبر 1996 کو ہم نے اپنے آبائی مکان سے نقل مکان کر کے لال نگر چھانہ پورہ میں نیا مکان لیکر یہاں شفٹ کیا۔ اس وقت میں اپنے ساتھ آبائی مکان سے صرف فیملی کے ساتھ گھریلو سامان برتن بستر اور لباس ساتھ لایا۔ اپنا زندگی بھر کا ادبی سرمایہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ وہیں پیک کر کے رکھا، یہ جان کر کہ

نیا مکان مکمل طور پر سنبھالنے کے بعد یہ ادبی سرمایہ وہاں سے اٹھا لاؤں گا۔ایک مدت کے بعد جب یہ ادبی سرمایہ لانے آبائی گھر آ گیا تو پتہ چلا چھوٹی بہن نے اسے ردی جان کر ردی والے کو تول کر بے مول بیچ دیا ہے۔ یہ جانکاری ملی تو لخت جگر کے اچانک فوت ہونے کی خبر سے یہ خبر کچھ کم نہ تھی۔کر کیا سکتا،سوائے س سر پیٹ کر ماتم کرنے لگا۔''نشانات'' میں شامل افسانے کہیں سے ادھر اُدھر کر کے حاصل کر لئے تھے۔اب انہیں ہی بچا کچھا اثاثہ جان کر محفوظ رکھا تھا۔ ادبی دنیا سے نکل کر میں اچانک سیاسی تاریخی اور صحافتی دنیا میں آ گیا۔یعنی ۱۹۷۵ء سے میری لاین بدل گئی۔اس کا شان نزول اس طرح ہوا کہ مجھے کشمیر کے سیاسی حالات کے پیش نظر ایک سیاسی ناول لکھنے کی ضرورت پڑی،''یہ کس کا لہو ہے کون مرا''؟ نامی اس سیاسی ناول نے مجھ پر جہاں سیاسی عتاب نازل کیا، وہاں یہ ناول ایک یادگار شاہکار بن گیا۔ریاست جموں وکشمیر میں اس ناول کے مسلسل ۹ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔26/ ہزار اس کی سیل ہوئی جعلی ایڈیشنوں کے بغیر کیونکہ بعض پبلشروں نے مانگ کو دیکھکر اس کے جعلی ایڈیشن بھی نکالے جن کی تعداد کا حساب نہیں رکھا جا سکا۔یہ پہلا ناول ہے جس کو عوام نے زیادہ رقومات دیکر ایک طرح سے بلیک میں خریدا۔اور جن کو اس کے باوجود بھی نہیں ملا، انہوں نے ہاتھ سے اس کی کاپی کر لی،کیونکہ اس دور میں فوٹو اسٹیٹ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس ناول کی مقبولیت نے مجھے ادبی دنیا سے نکال کر سیاسی اور پھر تاریخی دنیا میں لایا اور پھر صحافت کے ساتھ منسلک کر دیا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۹۷۵ء تک میں ادب کی دنیا میں ڈوبا ہوا تھا۔

۱۹۵۰ء سے لیکر ۱۹۷۰ء یعنی ادبی زندگی کے ۲۰ سال تک میں نے تین ناول، تنین ناولٹ ۱۰ ۱۲۱ افسانے ۲۲ ریڈیو اور ۸ ٹی وی ڈرامے لکھے، اسٹیج کے لئے صرف چند ایک ڈرامے لکھ سکا۔ میرے پہلے ناول ''زندگی اور موت'' پر اندھا قانون کے نام سے فلم بنی البتہ مجھے اس فلم کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھا گیا۔ سہاگ اور شعلے کے نام سے ایک فیچر فلم بنی اس کی شوٹنگ میں حصہ بھی لیا لیکن فلم کا اتہ پتہ نہ چل سکا۔ میرے ایک ٹی وی ڈرامے ''پانی کی چٹان'' پر فلم بنی ہیرو انیل کپور اور ہیروئین سری دیوی تھی۔ قیوم وڈیرا نے پرڈیوس کی۔ آرٹ فلم کے طور پر لی گئی۔ اسلیئے بٹ فلم کی طرح بزنس نہ کرسکی۔ ''آگ اور پانی'' اور ''ٹوٹے آئینے کی پرچھائیاں'' دو ٹیلی فلمیں، دوردرشن نے فلمائی۔

جیسا کہ میں نے ''نشانات'' کی اشاعت پر اس کتاب میں ''آ، اب لوٹ چلیں'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ ایک روز میرے اخبار کے دفتر پر سلیم سالک اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ آگئے۔ یہ دونوں کشمیر کے افسانہ نگاروں پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں جب ریاست کے افسانہ نگاروں کی فہرست مرتب کی تو، ظاہر ہے شبنم قیوم کے بغیر یہ فہرست نامکمل تھی۔ اسلیئے ہم سے ملکر ہمیں اپنی زندگی کے حالات ایک عدد افسانہ اور فوٹوگراف حاصل کرلیا۔

ان احباب کا میرے اخبار کے دفتر پر آنا افسانہ کا تقاضا کرنا اور ادبی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے مجھے اس بات کا احساس ہوا میں ابھی ادبی دنیا میں زندہ ہوں۔ اس احساس نے مجھے بحیثیت ادیب افسانہ نگار اور ناول نگار کے زندہ رکھنے کی حس دی۔ میں نے دستیاب افسانے جمع کرکے ان کو

کتابی صورت میں ''نشانات'' کے نام سے شائع کیا۔ اسی دوران میرے ہاتھ لگا میری ایک افسانوی مجموعہ ''ایک زخم اور سہی'' اس کی پہلی اشاعت اکتوبر 1971ء میں ہوئی ہے۔ اب اسے دوبارہ 2015ء یعنی 43 سال کے شائع کر کے ادبی دنیا کو بھینٹ کر رہاں۔ اس مجموعہ کے لگ بھگ سبھی افسانے ملکی اور بین الاقوامی زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ تین کہانیوں کی ڈرامائی صورت دی جا چکی ہے۔

شبنم قیوم



پروفیسر عبدالقادر سروری کے قلم سے

شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی

بحیثیت ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ اردو کشمیر یونیورسٹی ایک روز میں یونیورسٹی کے لان میں بیٹھا چند اساتذہ کے ساتھ کسی موضوع پر گفتگو کر رہا تھا میرے ایک طالب علم نے اطلاع دی کہ آپ سے ایک نوجوان ادیب ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو میں انہیں بلا لاتا ہوں میں نے حامی بھر لی اور اٹھ کر چند گز کے فاصلے پر ہولیا جہاں پر ایک نوجوان ہاتھ میں نوٹ بک لئے کھڑا میرے اور اپنے درمیانی فاصلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب یہ فاصلہ مٹ گیا تو انہوں نے ''شبنم قیوم'' کے نام سے مجھ سے اپنا تعارف کرایا۔ میں نے اس سے پہلے کئی رسالوں میں ان کا نام دیکھا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا'' اچھا تو آپ ہیں شبنم قیوم! میں سمجھا تھا شبنم قیوم کسی لڑکی کا نام ہے۔ خیر بتائیے میرے لائق کیا حکم ہے؟''

''یہ خوشی کا مقام ہے کہ آپ مجھے افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں مجھے اپنے چند طویل انسانوں کو کتابی صورت میں چھاپنے کا ارادہ ہے۔ اگر آپ انہیں دیکھیں گے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی''۔

میں نے ان سے مسودہ لیا اور انہیں ایک ہفتہ کے بعد جواہر نگر کے فلیٹ پر آنے کو کہا۔ شبنم قیوم سے دوسری ملاقات کے درمیان جب تک ان کا مسودہ میرے پاس رہا اور میں نے اسے نہیں پڑھا۔ میرا یہی خیال تھا آج کل کا نوجوان

جو افسانہ نگار بننے کے لئے اور افسانہ نگار کہلانے کے لئے وہی گھسے پٹے موضوع پر کہانیاں لکھ کر اپنے عشق اور عاشقی کی بھڑاس نکال رہا ہے ان میں ایک یہ بھی ہوگا۔ ہوسکتا ہے دوسروں کی دیکھا دیکھی انہیں بھی شاہ سواروں میں اپنا آپ دیکھنے کی ہوس ہو۔ میں نے ان سے معذرت کر کے ہفتہ بھر کی مہلت مانگی ان کے واپس جاتے ہی میں نے ان کا مسودہ دیکھنے کے لئے رکھا اور فرصت ملتے ہی میں نے مسودہ دیکھ لیا اور میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ کچھ دیر کے لئے میں یہ ضرور سوچنے لگا۔ کیا شبنم قیوم آج کا ایک نوجوان افسانہ نگار ہے یا اس تحریک کا رکن ہے جس تحریک کا ادب زندگی کا ادب کہلاتا ہے۔ ان فن کاروں پر جب میں نے ایک طائرانہ نظر دوڑائی جو اس تحریک کے روح رواں کہلائے جاتے ہیں۔ تو مجھے ان میں شبنم قیوم کی کہیں پر چھائی تک دکھائی نہیں دی البتہ ان کا ادب ان فنکاروں کے ہم پلہ پاکر مجھے بڑی خوشی ہوئی خوشی اس بات پر ہوئی ہمارے نوجوان ادیب بھی زندگی کا ادب تخلیق کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اس کی تازہ مثال میرے سامنے موجود ہے۔ اور میرے ہاتھ میں ہے۔

شبنم قیوم کو ان کی کہانیوں کے ساتھ ساتھ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا اور جب بھی دیکھا بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ میں نے انہیں اپنا اصلی مقام دلانے کی پوری کوششیں کیں جو تھوڑی سی بار آور بھی ہوئیں۔

شبنم قیوم کو میں وقتاً فوقتاً ملک کے نامور عالموں اور ناقدوں جن میں سید احتشام حسین، آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر شارب جیسی شخصیات سے ان کو متعارف کرایا۔ ملک کے نامور ادبی علمی شخصیات جو بھی اور جبھی کشمیر تشریف لائیں وہ ان کے یہاں ضرور حاصل کر لیتی اور

میں انہیں شبنم قیوم سے ضرور ملاتا۔ جب بھی میں نے انہیں کسی ایسی شخصیت سے ملایا تو ان کہانیوں کے ساتھ جنہوں نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ اسی دوران بھوپال سے پروفیسر خورشید عالم آئے تو میں نے انہیں شبنم قیوم سے ملایا، انہوں نے کوئی ایک ماہ تک سرینگر میں قیام کیا، انہوں نے شبنم قیوم کے افسانہ اور ناول مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کا مطالعہ کیا شبنم قیوم کی زندگی ان کے خیالات اور نظریات کا مشاہدہ بھی کیا، پروفیسر صاحب نے ''شبنم قیوم اور ان کا فن'' کے نام سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا اس کو پہلے مجھے دکھایا اور پھر میرے ایک خط کے ساتھ ماہنامہ ''مزاج'' بھوپال کے ایڈیٹر جناب عیسیٰ صدیقی کو بھیجا۔ اس طرح انہوں نے بحیثیت ایک فنکار کے شبنم قیوم کو ادبی دنیا میں متعارف کرایا۔

شبنم قیوم سے میرے قریبی تعلقات رہے۔ یوں جان لیں وہ میری فیملی ممبر بن گئے۔ میں ان ایام میں ''کشمیر میں اردو'' پر کام کر رہا تھا۔ شبنم قیوم نے اس پر کام کر رہا تھا۔ شبنم قیوم نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔ کشمیر کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے ساتھ ملاقات کے دوران شبنم قیوم میرے ساتھ ہوتے میں انہیں کشمیر کے خوبصورت مقامات کی سیر کو ساتھ لیتا ایک روز میں میری شریک حیات محمد حسن اور شبنم قیوم گھوڑوں پر سوار ٹنگمرگ سے گلمرگ جا رہے تھے۔ ان کا گھوڑا بدک گیا۔ اور وہ گھوڑے سے گر گئے البتہ زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ ایک ملاقات کے دوران میں نے ان سے کہدیا۔ آپ کا نام سن کر یا پڑھ کر ''لڑکی کا تصور آتا ہے۔ انہوں نے بتایا، شبنم واقعی ایک لڑکی ہے جس کو میں نے اپنے نام کے ساتھ جوڑا ہے۔ کیونکہ اسی لڑکی نے مجھے ادیب بنایا ہے۔ ان کی تخلیقات نے مجھے اس قدر متاثر کیا ہے کہ میں نے بھی افسانے لکھنے شروع کئے میرا یہ ماننا ہے ایسی لڑکی

نے مجھے افسانہ نگار بنایا۔

"ادیہ بات ہے کون ہے وہ لڑکی، کہاں رہتی ہے؟

میرے پوچھنے پر شبنم قیوم نے بتایا "میں نے اسے نہ دیکھا ہے۔نہ جانتا ہوں کہاں رہتی ہے اور نہ ہی وہ مجھے جانتی ہے اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوگا میں نے ان کا نام اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ کے لئے شامل کرلیا ہے۔

"بڑی دلچسپ کہانی ہے" سروری صاحب کچھ سوچ کر بولے

میں نے جواب دیا۔ "بس جان لیجئے' یہ بھی ایک افسانہ ہے۔

"ہاں! افسانہ ہی ہے اور اس کے کلائیمکس میں تجسس ہے"

سچ تو یہ ہے کہ شبنم قیوم کی زندگی بذات خود ایک افسانہ ہے۔ شبنم قیوم بڑا حقیقت پسند ہے۔

زندگی کے حقائق سے آنکھیں چرانا خواہ وہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں اس کی فطرت سے بعید ہے زندگی کے متعلق ان کا نظریہ بڑا اصالح اور صحت مندانہ۔ اور اسی لئے ان کے یہاں خالی خولی رومان اور عشق کے ڈھکوسلے جو مریضانہ ذہنیت کو جنم دیتے ہیں۔ مطلق نہیں ان کی کہانیاں دیکھئے تو ان میں اس کی بیباک انفرادیت کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آئینگی اور یہ بات کسی ادیب کے فن کے لئے استحکام کی دلیل رکھتی ہے انہوں نے ہر کہانی کے بنیادی کردار میں ایسی خصوصیت ابھاری ہے کہ پڑھنے والا چونکے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شبنم قیوم ایک دردمند دل رکھتا ہے طبعیت کا سادہ اور معصوم ہے خلوص، نرمی اور اپنا پن اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی تخلیقات میں درد اور تڑپ ہے زندگی کی گہرائیوں پر ان کی گہری نظر ہے وہ انسانی نفس کی حرکت کو اچھی طرح

سے دیکھتا ہے۔ اوراس کی ضرورت کو بیان کرتا ہے۔ وہ اس دور کے مادہ وسماجی حقائق کا باریک مبصر ہے۔ اسکے پاس حسن ادراک تشکیک، تخیلی پیش بینی، یادیں حقائق کا ایمان اور ہر قدر کی خاموش قدر شناسی کے عناصر موجود ہیں اور یہی عناصر انہیں ایک مکمل فن کار بناتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کی عمر مختصر ہے اور اس مختصر عرصے میں وہ انسانوں کے لئے براہ راست زندگی سے مواد حاصل کرنے اور فن کو جلا بخشنے کے لئے لگاتار محنت اور دلچسپی سے یہ سفر طے کر رہا ہے۔ اسکے اپنے تجربات اور مشاہدات نے انہیں اس بڑے شعور سے ہم آہنگ کو دیا۔ جس میں نبض گیتی سنائی دیتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کرداروں کی اپنی الگ دنیا ہے وہ فیصلہ اور پسند دوسروں پر نہیں چھوڑتا۔ اچھے برے جیسے بھی ہوں فیصلے اور پسند وناپسند ان کی اپنی ہوتی ہے۔ اسکے فیصلوں سے اختلاف ممکن ہے۔ لیکن ایک عام قاری بھی ان کے افسانوں میں وقت کی بے راہ روی اور ذہنی کش مکش کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی تازہ مثال ہے "ایک زخم اور سہی"۔

[illegible]
جموں اور کشمیر یونیورسٹی [illegible]
[illegible] ۱۱ اپریل ۱۹۶۲ء
جناب مکرم

[illegible]

(عبدالقادر سروری)

شبنم قیوم......اور اُس کا فن

پروفیسر خورشید عالم

بقول قمر اعظم ہاشمی اگر آفتاب کو طلوع ہوتے دیکھ کر آپ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یہ سمجھیں کہ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا ہے تو یہ اُس شاعر مجسم کا قصور نہیں قصور سراسر آپ کا ہے۔ حقیقتیں زیادہ دنوں جھٹلائی جاسکتیں۔ ممکن ہے کچھ دنوں اُنہیں دبا دیا جاسکے لیکن پھر ان کا پوری شدت کے ساتھ اُبھرنا بھی متیقن ہے اگر غالب پر اس کے عہد نے کیچڑ اچھالی تو غالب پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ غالب ابھرے اور پوری شدت سے اُبھرے۔ اس سے پہلے نظیر اکبر آبادی کو بورژوا طبقے نے میدان شاعری سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تو اس سے نظیر زیادہ عرصے تک دبے نہ رہ سکے۔ زمانہ آیا اور وہ ہاتھوں ہاتھ اُٹھائے گئے۔

ہمارے ہر نئے ادیب کے ساتھ کم از کم یہی سلوک کیا جارہا ہے۔ لیکن وہ ابھر رہے ہیں اور اپنے بل بوتے پر ابھر رہے ہیں۔ سرزمین کشمیر کے ایک قلمکار ادیب دانشور کے بارے میں بھی ہمیں ایسے خیالات کا اظہار کرنا پڑا ہے۔

شبنم قیوم نے فروری ۱۹۳۸ء میں کشمیر کی حسین وادی میں ڈل گیٹ کی اس سرزمین پر جنم لیا ہے جس کے بارے میں عام لوگوں کا خیال ہے، یہاں کی آب و ہوا ادب اور شاعری کو خوب راس آئی ہے۔ کیونکہ کشمیر میں دوسرے

علاقوں کی نسبت ڈل گیٹ نے قلمکاروں کی کثیر تعداد اردو اور کشمیری ادب کو دی ہے۔اپنے ہم عصر لکھنے والوں میں شبنم قیوم کم تعلیمیافتہ ہے، مگر اوروں کی نسب اس نے بہت زیادہ لکھا ہے۔۱۹۵۷ء سے وہ مسلسل لکھ رہا ہے۔اس وقت کم وبیش درجن بھر کتابوں کا وہ لیکھک رہا ہے۔مصنف کا لفظ میں جان بوجھ کر یہاں استعمال نہیں کرر ہا ہوں۔

شبنم قیوم ایسا فنکار نہیں جس کو یہ فن ورثے میں ملا ہو۔لیکن اس کے خاندان میں ادیب شاعری، صحافی اور ڈرامہ نگار سب ہی موجود ہیں۔اپنے پرائے لکھنے والوں کو اس کی تعلیم اور تحریر دیکھ کر یقیناً حیرت ہوتی ہے اور یہی حیرت ان کو اس کا رقیب بھی بناتی ہے۔شبنم قیوم کی اپنی علیحدہ دنیا ہے۔جہاں وہ بالکل تنہا ہمارے لئے کہانیاں لکھتے لکھتے خود ادبی رقیبوں کے لئے کہانی بن جاتا ہے۔ وہ فنکار پیدا ہوا ہے۔اس کا اعتراف ملک کے کئی نقادوں نے کیا ہے۔سید اختشام حسین نے بھی اس کے کمال فن کا اعتراف اپنے ایک خط میں کیا ہے شبنم قیوم کی زندگی بہت سے نشیب وفراز سے گزری ہے۔حیات کی پیچ در پیچ اور دشوار گذار راہوں کو اسے طے کرنا پڑا۔کبھی اس وسیع صحرائے حیات میں مدتوں تلاش آپ دوانہ میں بھٹکتے رہے اور کبھی جو منزل پر پہنچے تو ان کی منزل اور آگے بڑھ گئی۔زندگی کی انتھک کٹھن اور جاں گسل ساعتوں سے گزر کر کتنے ہی سخت لمحات کے کڑے کاٹ دیئے۔آفات وصدمات کی بھیانک موجوں کا مقابلہ کر کے تشکیک کی ان گنت تاریک گھڑیوں میں گر کر آزمائیشات کے نہ جانے کتنے مرحلوں کو طے کرلیا،

شبنم قیوم ایک درد مند دل رکھتا ہے۔ طبعیت کا سادہ اور معصوم ہے۔ خلوص نرمی اور اپنا پن اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ خودداری اور احساس دونوں ہی ہر لمحے اس کے ساتھ ہیں ۔ ان کی تخلیقات میں درد اور تڑپ ہے ۔ زندگی کی گہرائیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ فطرت انسانی سے وہ بخوبی واقف ہے۔ اس ... اس نے زندگی کی تمام زہرنا کیوں، تشنگیوں اور تلخیوں کو بڑے صبر اور سکون سے اپنے اندر سمولیا۔ اس نے احساس کے جسم پر نہ جانے کتنے زخم کھائے ۔ لیکن انسانیت کے رستے ہوئے ناسوروں کے علاوج کی خاطر اپنے درد کو پش پشت ڈالدیا۔ وہ انسانیت سے شدید محبت کرتا ہے۔ اس کو اپنے ماحول کی بے چارگی بے بسی، پریشانی اور افلاس کا شدت سے احساس ہے اور افسروہ ماحول میں وہ اکثر انسانیت کی روح کا متلاشی بھی نظر آتا ہے۔ اور اس کے لئے صدا بلند کرتا بھی ۔ وہ فریب دینا بھی خوب جانتا ہے۔ جب کبھی دشمنی پر اُتر آتا ہے تو اُس وقت ساری انسانیت کو بھول جاتا ہے جو اس عہد کے انسان کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ تعصب اور تنگ نظری نے کبھی اس کو چھوا بھی نہیں ہے۔ جھوٹ بھی اگر بولے گا تو اس طریقے سے کہ آپ کو اس کی حقیقت سے انکار نہیں ہو گا۔ اس کی دو تین ت تخلیقات پڑھ کر اگر منہ پھیر لیا جائے تو یہ اس کا قصور نہیں کسی چیز کے صحیح علم کے لئے گہرا مطالعہ شرط ہے۔ اس شخص سے ہنسی کا مطالبہ جس کا دل زخموں سے چور اور دماغ آلام سے ماؤف ہو خود غرضی نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ اکثر سوچتا رہتا ہے اور سوچ کر گہرائیوں میں وہ اتنا ڈوب جاتا ہے جہاں وہ ایک دیوانہ سا لگتا ہے اور سوچوں میں اکثر ڈوبے رہنے کا اعتراف اس نے خود کیا

ہے۔ میری نظروں میں ایک آٹو گراف بک گزرا ہے۔ جس میں ملک کے نامور فنکاروں اور سیاست دانوں میں شبنم قیوم کا آٹو گراف ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

جب مجھے یہ آٹو گراف پیش کیا گیا تو میں سوچنے لگا میں اس پر لکھوں تو کیا؟ میں سوچتا ہی رہا۔ اس لئے کہ سوچنا میرا عظیم مشغلہ ہے۔ اس کی بدولت میں کچھ پاتا ہوں اور کچھ کھوتا ہوں......دستخط

شبنم قیوم میدان ادب میں اُس وقت اترا جب اس کی عمر صرف ۲۰ سال کی تھی۔ ۲۸ سال کی عمر میں اس نے پہلا ناول لکھا ''زندگی اور موت'' اس کا اولین ناول ہے جو جذبات کی گہرائی، یقین کی روشنی اور انقلاب پسند رومانیت کے ساتھ ایک دلچسپ ناول ہے۔ اس ناول کے کرداروں کی غیر معمولی مقصدیت اور ان کا انقلابی جوش وخروش دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اس ناول میں اس کے بلند خیالات، اس کے فن کی پختگی خاص طور پر ظاہر ہے۔ بین الاقوامی مسائل میں قومی رنگ کو نبھاتے ہوئے اس نے انسانیت کی بنیادی صلاحیتوں پر نظر رکھی ہے اور ایسے کرداروں کو اُبھارا ہے جن کی داخلی کشمکش باریک سے باریک نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔ ''زندگی اور موت'' کے بعد انہوں نے کئی افسانے دو ناولٹ ضبط تحریر میں لائے ان کے مطالعہ سے بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اس نے زندگی کے مزاج کو سمجھنے کی پر خلوص کوشش کی ہے۔ انسانی فطرت کی بوقلمونی، اس کے تضاد، ضروریات اور چھوٹی بڑی الجھنوں کو جس طرح اس نے پیش کیا ہے وہ محض دلچسپ ہی نہیں بلکہ بصیرت افروز بھی ہے۔ اس کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کرداروں کے

اعمال کو خیر و شر، نیکی اور بدی یا سود و زیاں کے پیمانے سے ناپنے کا قائل نہیں ہے۔اس کی کہانیوں میں تلوار کی سی تیزی، آبگینے کی سی نزاکت اور شبنم کا سا حسن ہوتا ہے۔اس کی حقیقت پسندی میں زندگی کے گریزاں لمحات کو فن پاروں میں اسیر کر لینے کی صلاحیت، زندگی کی وسعتوں کو سمیٹ لینے کا رجحان متاثر کن ہے۔ اس کے یہاں زندگی کے پراسرار دھندلکوں اس کی پہنائیوں اور سر چشمے کا کھوج لگانے کی آرزو مچلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شبنم قیوم بڑا حقیقت پسند ہے۔زندگی کے حقائق سے آنکھیں چرانا خواہ وہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں اس کی فطرت سے بعید ہے۔زندگی کے متعلق اس کا نظریہ بڑا صالح اور صحتمندانہ ہے اور اسی بناء پر اس کے یہاں خالی رومان اور خیالی عشق کے ڈھکوسلے جو مریضانہ ذہنیت کو جنم دیتے ہیں، مطلق نہیں۔ان کی کہانیاں دیکھئے تو ان میں انفرادیت کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آئینگی اور یہ بات کسی ادیب کے فن کے لئے استحکام کی دلیل رکھتی ہے۔اس کی فطرت کا تیکھا پن، مزاج وارفتگی اور طبعیت کا بانکپن ان کی شخصیت کے ایسے جوہر ہیں جو فنی پختگی کی جلا کر کہانی کی تقلیدی فضا کو تاریکی میں بھی بڑی آب وتاب دکھاتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ روایت اور انفرادیت کا اس کے ہاں متناسب و متوازن امتزاج پایا جاتا ہے۔اسے ہم جنوں اور جنون اور شعور کی صحیح آمیزش بھی کہہ سکتے ہیں۔انہوں نے ہر کہانی کے بنیادی کردار میں ایسی خصوصیت ابھاری ہے کہ پڑھنے والا چونکے بغیر نہیں رہ سکتا اس کی افسانہ نگاری ملک کے متوسط طبقے کے مجرم مجبور اور مفلس ضمیر کی فریاد ہے۔اسے ہمارے اس ماحول کی بیچارگی، بے بسی، اضمحلال، پریشانی اور گندگی کا شدت سے احساس

ہے۔وہ تھکے افسردہ ماحول میں انسانیت کی رمق کی خاطر شدید صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ان کی کہانیوں کے گہرے مطالعہ سے ان کی تحریر صفحہ قرطاس پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے تازہ گوشت کے خون آلود لوتھڑے پڑے ہوں ۔اس کی واضح مثال ''لنکا کو جلادو'' میں نفسیاتی ردعمل کی تصویروں کے علاوہ ذہنی، آسودگیاں اور جنسی بے راہ رویاں ہیں جو مختلف جگہوں پر بڑی خوبی سے متشکل کی گئی ہیں۔ ''جس دیش میں جہلم بہتا ہے'' نامی ناول میں بیک وقت کشمیر کے حسن اور خوبصورتی میں اس کی مفلسی بیکسی کا اظہار کر کے کرداروں کی بے قدری کی نشاندہی کی ہے۔ کشمیر کو جاننے اور سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

شبنم قیوم اس زمانہ کی حرکت کو دیکھتا ہے اور اس کی ضرورت کو بیان کرتا ہے وہ اس دور کے مادی و سماجی حقائق کا باریک مبصر ہے۔ان کے پاس حسن ادراک، تشکیک، تخلیقی پیش بنتی ، یادیں، حقائق کا ایمان اور ہر قدر کی خاموش قدر شناسی کے عناصر موجود ہیں اور یہی عناصر ان کو ایک مکمل فنکار بناتے ہیں۔ان کی افسانہ نگاری کی عمر مختصر ہے اور اس مختصر سے عرصے میں وہ اپنے افسانوں کے لئے براہ راست زندگی سے مواد حاصل کرنا اور فن کو جلا بخشنے کے لئے لگاتار محنت، دلچسپی اور لگن سے یہ سفر طے کر رہا ہے۔ان کے اپنے تجربات و مشاہدات نے اس کو اس بڑے شعور سے ہم آہنگ کر دیا جس میں نبض گیتی کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔اس کے افسانوں کے کرداروں کی اپنی اپنی دنیا ہے۔وہ فیصلے دوسروں پر نہیں چھوڑتا اچھے برے جیسے بھی ہوں، فیصلے اور پسند و ناپسند اس کی اپنی ہوتی ہے ان کے فیصلوں سے اختلاف ممکن ہے۔لیکن ایک عام قاری بھی ان کے

افسانوں میں وقت کی بے راہ روی، ذہنی کشمکش بھوک اور پیاس کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے کردار زندہ کردار ہیں۔ وہ اپنی دنیا خود بناتے اور بگاڑتے ہیں شبنم قیوم کو کہانی لکھنے کے فن پر قدرت تامہ حاصل نہیں ہے لیکن ایسے معمولی واقعات اور حادثات جو ہماری اور آپ کی نظروں کے سامنے سے اکثر بیشتر متوجہ کئے بغیر گزر جاتا ہیں ان کے پاس پہنچ کر واقعہ معجزے بن جاتے ہیں۔ اس کی تازہ مثال ''زخمی معجزے'' ہے۔

شبنم قیوم زیادہ تر طویل افسانے لکھتے ہیں۔ اس کے طویل افسانوں کے بارے میں سید احتشام حسین کا لطیفہ، جب بھی میں اس کا کوئی نیا افسانہ پڑتا ہوں، یاد آتا ہے۔ احتشام صاحب ایک روز ان کے ہاں کھانا کھا رہے تھے۔ جب انہوں نے ایک کے بعد ایک سالن آتے دیکھا تو شبنم قیوم صاحب سے فرمایا: اس کی کیا ضرورت ہے یہ تو بہت ہے۔

شبنم قیوم نے ازراہ مہمان نوازی جواب دیا۔ یہ تو ہم نے مختصر بنایا ہے احتشام صاحب بیساختہ بول اُٹھے: ارے! یہ مختصر ہے؟ یہ تو طویل افسانہ ہے۔

شبنم قیوم کا فن اس کے قلم کی نوک پر سیاہی کے قطرے میں ہوتا ہے۔ وہ کہانی لکھنے کا موڈ زبردستی اپنے اوپر طاری نہیں کرتا۔ نہ ہی گھنٹوں بیٹھ کر پلاٹ کا تعین کرتا ہے۔ وہ باتوں باتوں میں۔ کہانی کو جنم دیتا ہے۔ وہ مسائل حیات میں چلتے پھرتے مواد اکٹھا کرتا ہے۔ اس نے ملک اور قوم کر ہر پہلو سے دیکھا ہے اور سماج کی خامکاریوں کا خوب تجزیہ کیا ہے۔ اس کی تخلیقات میں سیاسی، معاشی، معاشرتی تبدیلیوں کا عکس پوری طرح نمایاں ہے۔ وہ انقلاب پسند ہونے کے

کیساتھ اصلاح پسند بھی ہے۔اس کی مثال ''پرانی ڈگر نئے قدم'' میں ملتی ہے۔ بظاہر اس ناول کا موضوع غنڈہ گردی کا وہ دور ہے۔جب جمہوریت کا خون ہورہا تھا۔مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا موضوع جنس اور صرف جنس ہے لیکن مصنف صرف جنسی بصیرت کا مظاہرہ نہیں کرتا ہے۔وہ اپنے کرداروں کو صرف جنسی چولا پہنا کر ہم سے متعارف نہیں کرتا بلکہ وہ جنسی تفسیات کی کسوٹی پر اس کردار کو پرکھتا ہے جس سے صرف کردار ہی نہیں حالات و واقعات بھی متاثر ہوتے ہیں۔اس نے جنس کے ہر معاشرتی اور نفسیاتی پہلو کو اس ناول میں اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ اس نے اس دور پر ایک بھرپور تھپڑ اور ایک زوردار تازیانہ لگایا ہے جس میں نہ صرف شریف عورتیں اپنی عزت محفوظ نہیں سمجھتی تھیں۔ بلکہ خوبصورت مرد بھی اپنے گریبانوں میں منہ ڈالا کرتے تھے اس ناول کو جو انفرادیت حاصل ہے وہ مسلمہ ہے۔اس نے ناول میں سماج کی نت نئی مگر مذموم باتوں کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ قوم پر تازیانے لگائے ہیں اور وطن کی حمیت کو جھنجھوڑا ہے۔اس نے قومی تہذیب کے اجڑتے اس کے وقار کو گرتے اور اس کی آن پر دھبہ لگتے دیکھ کر ایک ایسی چیخ ماری ہے جس میں زلزلہ کی سی قوت موجود ہے۔اور یہی چیخ ''پرانی ڈگر نئے قدم'' کہلاتی ہے ایسی ہی ایک اور چیخ اس نے اپنے دوسرے ناول ''چراغ کا اندھیرا'' میں بھی لگائی ہے۔مگر اس میں انہوں نے سماج کے غنڈوں ،قوم کے لیڈروں اور ملک کے دشمنوں کے بجائے حاکموں اور سیاسی ٹھیکیداروں پر ایسی ضربیں لگائی ہیں جو متاثر کن ہیں۔اس ناول کے موضوع کے حقیقی ہونے کا ہر ایک کو اعتراف ہے۔

ناول کی کسوٹی پر جب ہم شبنم قیوم کے ناول یہ دیکھنے کے لئے پرکھتے ہیں کہ آیا یہ اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں یا نہیں تو ہمیں بیک وقت ہاں اور نا کرنا پڑتا ہے۔ ہاں اس لئے کررہے ہیں کہ شبنم قیوم ناول کے فن سے پورا واقف ہے اور اس کا ہر ناول زندگی سے بھرپور ہے اس میں ایسی کمزوریاں بھی جھلکتی ہیں جو بری طرح، کھٹکتی تو نہیں لیکن اس کے فن پر اپنا اثر ضرور ڈال رہی ہیں۔ شبنم قیوم کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے بارے میں ضیاء عظیم آبادی نے ایک مقالے میں لکھا ہے۔

"شبنم قیوم ناول نگار افسانہ نگار پیدا ہوئے ہیں۔ ان کو اس صنف سے فطری مناسبت ہے اور س کا انداز تحریر بتا رہا ہے۔ وہ بلاشبہ مستقبل کے عظیم ناول نگار اور افسانہ نگار ثابت ہوں گے۔ وہ قاری کی سطح پر آکر نہیں بلکہ قاری کو اپنی سطح پر لاکر لکھتے ہیں۔ ان کے ناول اور افسانے میں کہیں بھی ناسمجھ لوگوں کو خوش کرنے کی کوششیں نہیں ملتی۔ بلکہ ان کے ہر قدم پر بلندی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا فنکار بالغ نظر ہے، اپنے پہلو میں دردمند دل رکھتا ہے اور جیتا جاگتا مرقع پیش کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شبنم قیوم کا قلم ابھی رُک رُک کر چلتا ہے۔ اس میں تلوار کی سی کاٹ نہیں آنے پائی ہے"۔

شبنم قیوم خوش نصیب سے کشمیری ہے کشمیریوں کا اپنا مزاج اور کلچر ہے وہ نہ دوسروں پر اپنی روایات کا بوجھ لادنا چاہتے ہیں، نہ خود کسی کی روایات کے احترام میں خود فراموشی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور جاننے کے لئے دیدہ بینا کی ضرورت ہے۔ دور سے نظارہ کر کے فیصلہ نہیں کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے اب

تک یہاں کی روایات اور ماحول پر قلم اٹھایا ہے ۔انہوں نے اس کا نظارہ دور سے کیا ہے ۔اسی لئے کسی کی تخلیق میں صحیح کشمیر دکھائی نہیں دیتا۔ایمل زولا نے بتایا ہے۔ناول کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ جس عہد میں لکھا جائے اس عہد کی جیتی جاگتی تصور نظر کے سامنے کھڑی کر دے۔شبنم قیوم کے ناولوں اور افسانوں میں یہ خصوصیت بدرجہ تم موجود ہے۔کردار نگاری کے بارے میں بھی شبنم قیوم ایک کامیاب ناول نگار کہلانے کا مستحق ہے۔انہوں نے جو کچھ بھی پیش کیا حقیقت پر مبنی ہے۔

"شبنم قیوم آدرش داد کا نعرہ لگانے والوں میں نہیں ہے۔وہ ایک حقیقت پسند فنکار ہے۔اس کے یہاں سچائی گام گام پر اپنے جوہر دکھاتی ہے۔وہ زہر کو قند کہہ کر معاشرے کی گندگی بڑھانا برداشت نہیں کرتے بلکہ ایک مخلص معالج کی طرح پہلے ہی قدم پر رہنے والے ناسور کا سد باب کرنا ضروری سمجھتے ہیں (ایک مصنف ایک تصنیف)

ہمارے ادب میں شخصیت پرستی کی وبا بڑے زوروں سے پھیلتی جارہی ہے من قال کی عظمت نے ما قال کی اہمیت کو تقریباً معدوم کر دیا ہے۔حالانکہ ادب زبان ومکان اور اشخاص سے ہمیشہ بالا رہا ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی ابدیت اور آفاقیت کبھی مسلم نہیں ہوسکتی تھی۔ہمارے نقاد جب بھی شہب قلم کی جولانیاں دکھاتے ہیں تو داؤ پیچ سے آگے نہیں بڑھتے اور وہ صرف بڑے بڑے ناموں کے گرد گھومتے دکھائی دیتے ہیں ۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان قدیم و جدید ادیبوں وشاعروں کے جواہر پاروں کو منظر عام پر لایا جائے جو غیر معمولی فنکارانہ

صلاحیتوں کے باوجود گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ شخصیت پرستی اور ناقدری نے ملک کے کتنے ہی قابل جوہروں کو شہرت دوام اور قدر عام سے محروم کر دیا ہے۔

شبنم ہندوستان کا ابھرتا ہوا فنکار ہے۔ ایڈیٹر نگارش امرتسر مہندر باوا نے ان کو کشمیر کا اے حمید لکھا ہے۔ ان کے فن کو ایک لمبے عرصے تک نظر انداز کرنے کے بعد خوش قسمتی سے اب کئی جانب سے انہیں سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور توقع کی جاتی ہے۔ شبنم قیوم اردو ادب میں جلد ہی وہ مقام حاصل کرے گا جس کا وہ صریحاً طور پر مستحق ہے۔

(ماہنامہ "مزاج" بھوپال۔ مارچ ۱۹۶۷ء)



دُکھتی آنکھیں

ہسپتال کے احاطہ میں بیٹھے ہوئے بوڑھے نے جب گریبان سے سر نکال کر بیمار بیوی کی طرف کنکھیوں سے دیکھا تو اسے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے دق کی مریضہ کو اب بھی کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ ہسپتال میں آتے ہوئے یہ ان کا تیسرا دن تھا اور ان تین دنوں میں بیوی نے اس سے پوچھا تھا۔

"جب تم رشید کو یہ کہنے گے تھے کہ تمہاری ماں بیمار ہے اور وہ ہسپتال میں داخل ہورہی ہے تو اس نے تمہیں کیا جواب دیا تھا......؟ وہ اب تک یہاں کیوں نہیں آیا؟!"

بوڑھے نے اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا دفعتہً اس پر سکتہ سا طاری ہوا......اس نے تھوڑی دیر کا سکوت توڑ کر کہا۔

"فاطمہ! اب دیر ہورہی ہے۔ ڈاکٹر تجھے اس وقت تک یہاں دیکھے گا تو......!"

"آں......ہاں......!......مجھے سردی بھی لگ رہی ہے۔ اب میں لیٹ جاؤں گی......"!

اور بوڑھی مریضہ وارڈ نمبر 4 میں جب اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ تو بوڑھا،

تھوڑی دیر تک وہیں منڈلاتا رہا۔ پھر باہر نکل کر احاطہ کے ایک ٹیلے پر بیٹھ کر نہ جانے کیا سوچنے لگا۔

جب سے فاطمہ دق کے مرض میں مبتلا ہوئی جب سے بوڑھے سلطان نے اس کی دل بہلائی میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن ہسپتال میں آنے کے بعد خود اس کی حالت قابل رحم تھی۔ خاص طور پر ہسپتال کے کسی ماہر ڈاکٹر کے لئے جو اس کے معائینے کے بعد اس کے لئے بھی بیڈ کا انتظام کرواتا اور اس طرح میاں بیوی ہسپتال کے ماحول میں اپنی اپنی زندگی کے بقیہ ایام پورا کرتے۔

بوڑھی فاطمہ اس وقت بھی بیڈ پر دراز، جوان بیٹے کی یاد میں اسی طرح وقت گذار رہی تھی، جس طرح کوئی سادھو بھگوان کی یاد میں اپنا وقت گذارتا ہے اور باہر احاطہ کے ایک ٹیلے پر بیٹھ کر بوڑھے کو اس بات کا پورا پورا احساس ہو رہا تھا۔ مگر......شائد اب وہ اس بارے میں اپنے آپ کو بے بس، لاچار اور معذور جان رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر بیٹے رشید کا جواب کوس رہا تھا۔

سر بہ گریبان ہو کر وہ اسی بے بسی میں اُلجھا ہوا تھا کہ اس نے ایک دلدوز آہ بھرتے ہوئے سر کو اُٹھایا۔ آنکھوں کو مل کر جونہی اس نے نگاہوں کو منتشر کیا اس کی نظر پُرانے گرجے کے مینار کی طرف اُٹھ گئی۔ جس گرجے میں وہ بچپن میں حضرت عیسیٰؑ کے پھانسی پر لٹکانے کی فلم دیکھا کرتا تھا۔

آج سے تقریباً پچاس ساٹھ برس پہلے، جب بوڑھا اسی درگجن علاقے میں بچپن کی کھیل کود میں مصروف تھا۔ جب یہ ہسپتال انگریزوں کا مشن ہسپتال کہلاتا تھا۔ مگر آج......آج تو یہ چسٹ ڈیزیز Chest Disease ہسپتال کے

نام سے یاد کیا جا رہا ہے۔

جس طرح وقت اور زمانے نے مشن ہسپتال کو چسٹ ڈیزیز ہسپتال میں بدل دیا اسی طرح عمر کے شمار نے سلطان کی زندگی جوانی سے بڑھاپے میں منتقل کی......اس گرجے کے مینار کے عقب میں سورج افق کو ارغوان زار بنا رہا تھا، یہی مینار بوڑھے کو پُرانی چیز اور ارغوان زار افق پُرانی یاد دکھائی دی......افق کے شفق زار میں دہکتا ہوا پرانا سورج جو زندگی کی بہاروں میں بھی بالکل اسی طرح گرجے کے عقب میں ڈوبا کرتا تھا......اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔

چاند ہو یا سورج ہر ایک اپنے وقت پر اُبھرتا ہے اور ڈوبتا ہے چاہیے وہ انسان کی آبادیوں پر اُبھرے یا بربادیوں میں ڈوبے اسے انسان کے ماضی حال اور مستقبل کے ساتھ کوئی واسطہ اور ہمدردی نہیں۔

بوڑھے کے سامنے یہ وہی مقام تھا۔لیکن پُرانی یادوں کے کہر میں سے اس مقام کی جو دلفریبیاں جھلکا کرتی تھیں وہ......، وہ شاید مردہ انسانوں کی طرح دفنائی گئی تھیں۔

اسی طرح جب سورج ڈوب گیا اور تاریکی نے دن بھر کی چھل پہل کو رفتہ رفتہ جذب کرلیا۔تو بوڑھا یونہی خلاء میں تاکنے لگا اور اس انداز سے تاکنے لگے گویا خلاء اسے بچپن کی یاد دلا رہا تھا۔

آج سے بہت پہلے گویا کل ہی کی بات تھی۔اسے اس بات کا کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا۔درگجن ڈل گیٹ کے رنگین لمحات کو گذرے نصف صدی ہوئی ہے۔ جس نصف صدی میں آبادیاں، ویرانیاں اور ویرانیاں آبادیاں بن گئی ہیں۔

انسان کا حافظہ دردناک واقعات کو بہت جلد نہیں تو آہستہ آہستہ بھلا ہی دیتا ہے۔ مگر خوشگوار یادوں کے لئے ہمارا وسیع خلاء کبھی بادل بن کر چھا جاتا ہے۔ کبھی چاند اور سورج چمکاتا ہے۔ کبھی بجلیاں، لپکاتا ہے اور کبھی تاروں کو ٹمٹاتا ہے اور اسی خلاء نے بوڑھے کو نصف صدی پہلے کی دنیا میں دھکیل دیا۔

بوڑھا سلطان اصل میں اسی ڈلگیٹ کا باشندہ تھا۔ بچپن میں اس نے عشق کر کے شادی کر لی تھی۔ اور بیوی کو لے کر وہ والدین کی نظروں سے دور اس علاقہ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر چلا گیا تھا۔ بچپن تو اس نے نہایت خوشگوار گذارا تھا۔ مگر بچپن کے آنگن سے نکل کر جب جوانی کے میدان میں اُتر آیا تو اُسے زندگی کی نشیب وفراز سے بُری طرح دوچار ہونا پڑا۔ شادی کے تیسرے سال وہ ایک بیٹے کا باپ بنا لیکن یہ بیٹا کم سنی میں اسے داغ مفارقت دے گیا۔ اسی طرح جب یکے بعد دیگرے تین بیٹوں اور دو بیٹیوں نے وقت بے وقت جنم پا کر داغ مفارقت دیا۔ تو بیوی سمیت اس کی زندگی......اور اس زندگی کا رمق ہی اکارت ہو گیا۔ اس طرح اُن کی دنیا ہی لٹ گئی اور جہاں......وہ تو گھناؤنا اور تاریک ہو کر رہا۔ آخر خدا کی بارگاہ میں جبہ سائی کر کے اور آستانوں پر نذر و نیاز چڑھا کر خدا نے انہیں ایک اور اولاد سے نوازا، جس کو یہ دونوں زندہ اور مردہ ......ایک ساتھ جان رہے تھے۔ کیونکہ اسی اولاد کی جدائی نے انہیں دق کے مرض میں مبتلا کیا۔

اس وقت خلاء کو تاکتے ہوئے اسی اولاد کی حرکات وسکنار تصور کی صورت میں ایک دُکھیارے باپ کے روح بھرے دل کے قرطاس پر اُبھر رہی تھی اور اسی

اولاد کو ماں کی ماتا اس طرح یاد کر رہی تھی۔ جس طرح ایک مصیبت زدہ آدمی خدا کو یاد کرتا ہے۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا اور بوڑھا ابھی تک خلاء کو تک رہا تھا۔ یکا یک اسے اپنی بینائی کی کمزوری کا احساس ہوا۔ اور اس احساس نے اس کے تن و بدن میں ایک ایسی حرکت پیدا کر دی کہ وہ اُٹھ کھڑا ہو کر یہاں سے چلدیا......لان کی چند سیڑھیاں اترتے ہی وہ غیر رادی طور سے رک گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ دفتر میں رشید سے مل کر گھر لوٹ رہا تھا...... وہ سیڑھیاں بھی ایسی ہی تھیں......

آج سے چند روز پہلے رشید کی زبان سے نکلی ہوئی زہریلی آوز جو اس کے تن و بدن میں ایک ہیجان بپا کر گئی تھی۔ اب بھی اس کا تعاقب کئے ہوئے تھی۔ بوڑھا نہ جانے کب تک اسی طرح پڑا رہتا کہ فضاء کی بڑھتی ہوئی تاریکی نے اسے ڈیرے پر جلدی جلدی پہنچنے کی ترغیب دی۔

دوسرے دن صبح بوڑھا دل بہلانے کی غرض سے بیوی کو دھوپ سیکنے کے لئے باہر لے آیا۔ ہسپتال کے احاطہ میں جہاں پر بیمار اور ان کے تیمار دار دھوپ سیکنے جمع ہو رہے تھے۔ بوڑھا اس سے آگے سبھوں سے الگ تھلگ اپنی مریض بیوی کو لے جا رہا تھا۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک دوسرے کے سہارے آگے کو بڑھے۔ ان کی نحیف پیکروں کو دیکھ کر ایسا دکھائی دے رہا تھا گویا خزان کے اس موسم میں دو سوکھے پیڑ بچپن کی بہار ڈھونڈتے جا رہے ہیں۔

چلتے اور بڑھتے ہوئے بڑھیا کے جسم میں درد کی ٹیس سی اُٹھنے لگی۔ بوڑھا اس کی حالت کو بھانپ گیا اور بے تاب ہو کر بولا۔

''فاطمہ! تھوڑی دیر ستالو پھر......''

''نہیں......چلو!'' بڑھیا نے مایوسی کی لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

نومبر کی دھوپ سینکنے جب دونوں ایک جا بیٹھ گئے۔ تو دونوں نے ایک دوسرے کو بھرپور نظر سے دیکھا اس نظر میں جو ایک ساتھ جینے اور ایک ساتھ مرنے کا عزم رقصاں تھا وہ انہیں بچپن کے خوشگوار زمانے میں کیا ہوا وعدہ یاد دلا رہا تھا۔

ایک دوسرے کو بغور دیکھتے ہوئے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھومتے ہوئے جب سامنے حجاب ناچنے لگا تو دونوں نے زیر لب مسکرا کر اور پھر نگاہوں کو اپنے اپنے دامن پر مرکوز کیا۔ دونوں میں تھوڑی دیر تک گومگو کی کیفیت طاری رہی کہ بڑھیا نے آہستہ سے سر اُٹھا کر اور متقین نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بوڑھے سے کہا ''میری آنکھ دکھتی ہے۔ شائد......!''

''آزمائش کی ہے؟ اس نے فوراً پوچھا

''ہاں! بشارت ہے......شاید رشید آجائے گا۔''

رشید کے آمد کی بشارت پا کر بوڑھے کو قدرے ڈھارس ہوئی۔ لیکن دوسرے لمحے......وہ حسرت بھری آہ کھینچنے کو تھا کہ اسے سامنے دِق کی مریضہ کے آہیں بھرنے کا احساس ہوا۔ اب وہ اس کی ڈھارس بندھانے اور دل بہلانے کا کوئی موضوع ڈھونے لگا۔

خوشگوار یادوں کے لئے اگر ہمارا وسیع خلاء درخشاں رہتا ہے تو پھر بوڑھے کے سامنے ماضی کی خوشگوار یاد تصور بن کر کیوں نہ آتی۔

یکا یک اس کے لرزتے ہونٹوں پر تبسم کی لہر سی آگئی اور اسی کیفیت میں وہ

بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ فاطمہ! تجھے کچھ یاد ہے؟'

بوڑھی کے خشک ہونٹوں پر لرزش سی آ گئی اور بولی۔"......کیا یاد ہے؟"

بوڑھے نے تھوڑی دیر تک کوئی جواب نہیں دیا اور پھر اس کے گھمبیر چہرے کو کنکھیوں سے دیکھ کر بولا۔"فاطمہ! میرا دل چاہتا ہے۔ آج ہم پرانے ارمانوں کے باغوں میں اپنی روح اور ضمیر کے جذبوں کو ڈھونڈ نکالیں، جو عرصہ ہوا اسی ڈلکیٹ میں پیدا ہوئے تھے"۔

بڑھیا نے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔"تو......تم بچپن کے زمانے کو عرصہ تو نہیں کہتے ہو؟"

"بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا......"دراصل بات یہ ہے کہ مجھے ایسا لگ رہا ہے گویا کل کی ہی بات ہے......تمہیں یاد ہے نا؟ یہاں ہم نے کیسے کیسے دن اور کیسی کیسی شامیں ایک ساتھ گذاری تھیں......وہ دیکھو نا، ناشپاتی کا درخت، اب یہ بھی ہماری طرح بوڑھا ہو گیا ہے۔ ان دنوں جب ہم اس کا پھل کھایا کرتے تھے۔ وہ جوان تھا......بے چارہ......!! اب تو شائد یہ بھی سوکھ گیا ہے"......فاطمہ! جس طرح سوکھا پیڑ پھل نہیں دیتا ہے۔ اسی طرح بوڑھا آدمی......" اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا وہ تھوڑی دیر بعد گھمبیر مگر متاسفانہ انداز میں بولا......، فاطمہ! اُن دنوں جب ہمارا آپسمیں ملاپ ہوا، جب ہم نے ایک ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائیں اور جب ہم نے باغی بنکر بیاہ رچایا تجھے اولاد کی زیادہ تمنا تھی نا؟!"

یہ سنتے ہی بڑھیا کے سوکھے پتلے جسم میں ایک تند آندھی سی آئی جس نے

اسے بڑھاپے کی منزل سے کسی دشت نامعلوم کی طرف پہنچا دیا۔ بوڑھا اس کی حالت پر من ہی من میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا اور پھر پینترا بدل کر بولا۔

"فاطمہ! ادھر دیکھو میری طرف......، وہ ہسپتال کے بائیں باغ کے اُس سرے پر جو عمارت ہے...... ہے نا؟"۔

بوڑھی نے عمارت سے نگاہیں ہٹا کر سلطان کے چہرے کو بھرپور نظر سے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا لیکن ساتھ ہی خاموش زبان میں اس کا مطلب پوچھا تو بوڑھا مصنوعی مسکراہٹ سے بولا۔ "اُن دنوں ہم نے جو آپس میں ملنے ملانے کی جگہ منتخب کر رکھی تھی وہ......، وہ یہی عمارت ہے نا؟ اور اُن دنوں ......، تم کو یاد ہے نا؟ اپنے اپنے گھروں سے بھاگ کر ہم اس عمارت میں چھپے رہتے تھے......اور پھر جب ہم نے چوری چھپے شادی کر لی تو...... ہاں وہ بوڑھا دھوبی! تجھے یاد ہے نا......؟ اس نے ہمیں اولاد کی طرح چھپائے رکھا تھا......نہ جانے کب کا مر چکا ہوگا...... بے چارہ......!"

بوڑھی نے لمحے بھر کے لئے حافظے پر زور دیا اور زیر لب مسکرا کر کہا

"آں......ہاں یاد ہے"۔

"اُن دنوں میں کتنا سرکش ہوتا تھا......تم بے حد خائف رہتی تھیں"

بوڑھی کے خشک ہونٹوں پر تبسم سا آ گیا۔ وہ بچپن کے سرکش عاشق کو ٹکٹی باندھے دیکھنے لگی اور نگاہوں ہی نگاہوں میں بولی۔

"تمہاری سرکشی میں لگاؤ کا پہلو جھلکتا تھا۔ میرے سرتاج!"

"فاطمہ! تجھے یاد ہے ہماری وہ پہلی ملاقات گویا کل کی ہی بات ہے! تم

اپنی ماں کے ساتھ نہ جانے کیا کرنے یہاں آئی تھیں اور یہیں پر میں نے تمہیں......" نہ جانے بوڑھا آگے کیا کہنے والا تھا کہ بوڑھی نے اپنے بچپن کے عاشق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبا دیا اور کہا۔ "میں بہت حسین تھی نا؟ اس لئے مجھے دیکھتے ہی تم میرے گرویدہ ہو گئے۔"

"ہاں یہی بات ہے۔ مگر......!" بوڑھا خاموش ہوا اور کچھ سوچ کر بولا۔

"فاطمہ! ایک بات بتاؤ، ان دنوں میں تجھے کیسا لگ رہا تھا......میرا مطلب......اگر تجھے بھی میری سچی محبت تھی تو......تو مجھے کبھی کبھار طعنے کیوں دیتی تھی؟"

"مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ ویسے اگر میں نے کبھی کبھار ایسا کیا ہو تو اس لئے کہ تم نے میرے آنے جانے کو دوبھر کر دیا تھا۔"

بوڑھی نے عذر پیش کیا تو اس عذر سے بوڑھے کا دل یونہی پسیجا، اسے اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسا کہ وہ بورھا نہیں بلکہ جوان سلطان تھا۔ جس کے پہلو میں دوشیزہ فاطمہ اپنے بے قصور ہونے کی صفائی پیش کر رہی تھی۔ دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے اور پھر بوڑھے نے اس انداز سے سکوت کو توڑا گویا اسے کوئی کھوئی ہوئی بات یاد آ گئی تھی۔

"اور ہاں وہ......، وہ عہد......، تم کو یاد ہے نا؟ شادی کے روز ہم نے ایک ساتھ جینے اور مرنے کا عہد کیا تھا......کیا بچپن تھا وہ، ویسے عمر کے لحاظ سے ہم اتنے بوڑھے نہیں ہیں جتنے دکھائی دے رہے ہیں۔ خدا کو یہی منظور تھا جو اس نے ہماری تمناؤں کو کچل کر ہمیں پائمال کیا......، تمہیں یاد ہے نا......؟ شادی سے پہلے جب ہم اپنے اپنے گھروں سے بھاگ نکلے تھے۔

تو ہمیں شادی رچانے کی کتنی فکر تھی اور جب شادی ہو گئی تو شادی کے بعد ہم اولاد کے لئے کتنے ترستے تھے۔ مقدر کا کھیل دیکھو سات بچے جن کو بھی آج ہم اولاد کے لئے ترستے ہیں۔

یکا یک دق کی مریضہ کا دل بھر آیا اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس کا تو دل تڑپنے لگا، جگر اچھلنے لگا اور کلیجہ مسوسنے لگا ! بچپن کے عشق و محبت کی مسرت بڑھاپے کی حسرت و غم میں جو مبدل ہوئی تو یاس بھری آنکھوں پہ آنسو ابھرنے لگے اور یہ آنسو اس کے بدنصیب دامن کو تر کرنے کے لئے پلکوں پر لرزنے لگے۔

بیوی کی حالت دیکھ کر بوڑھا سخت پریشان ہوا اور تشفی آمیز لہجے میں بولا "فاطمہ! یہ تم کیا کر رہی ہو، تمہارے لئے کسی بات پر پچھتانا ٹھیک نہیں جب تک میں زندہ ہوں تجھے کوئی پروا نہیں۔ میرے جیتے جی تم ہر وقت خوش رہنے کی کوشش کرو تم جانتی نہیں یہ دنیا ایسی ہی ہے یہاں کسی پر بھروسہ نہیں چاہے وہ اولاد ہی کیوں نہ ہو!"

بوڑھی شکایت آمیز لہجہ میں بولی! "اچھا جب تم رشید کو یہ کہنے گئے تھے تیری ماں بیمار ہے اور وہ ہسپتال میں داخل ہو رہی ہے۔ تو اس نے کیا کہا تمہیں جب کہ وہ اب تک نہیں آیا!"

بوڑھے نے ایک ٹھنڈی آہ بھر لی! بیٹے کا جواب اس کے جسم کے اندر برچھی بن کر اتری۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ کوئی جواب دے نہ سکا۔

دق کی مریض کو بوڑھے کا خاموش اضطراب اور جوان بیٹے کی یاد برچھی سی بن کر

سینے میں اتر گئی۔ اس کا سر چکرانے لگا بدن اور بدن کا انگ انگ تھرتھرانے لگا دق کی مریضہ تھی اس لئے تاب نہ لا کر گر گئی۔

وارڈ ۴ میں جب اس نے اپنے بیڈ پر آنکھیں کھولدیں تو اسے ایسا افسوس ہوا گویا وہ کوئی خواب دیکھ کر جاگی تھی۔ اس کے آنکھیں کھولتے ہی بوڑھے نے اطمینان کی لمبی سانس لی اور اپنے لرزتے ہاتھ کو اس کے ماتھے پر رکھ کر پوچھا۔

''کیا حال ہے فاطمہ!''

بوڑھی نے سلطان کے چہرے کو بھرپور نظر سے دیکھا اس نظر میں جو حسرت کا پہلو جھلکتا تھا وہ بوڑھے کو کہہ رہا تھا۔

اپنا حال کیا بتاؤں تم خود دیکھ رہے ہو۔

بوڑھے نے جو اس کے ماتھے پر سے ہاتھ آٹھانا چاہا بوڑھی نے فوراً اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور کہا، ''رشید تو نہیں آیا؟''

''شاید آجائے گا'' اس نے پریشان انداز میں جواب دیا ''یہ دیکھو میری آنکھ دکھتی ہے۔ بشارت ہی ہے''۔

''تم اسے بلا کیوں نہیں لاتے''؟ اسکی آواز میں التجا تھی یہ التجا نشتر بن کر بوڑھے کے دل میں اتر گئی۔ وہ سخت پیچ و تاب کھاتا رہا کچھ دیر بعد وہ کھڑا ہوا، ماں کی ممتا کا خیال کر کے اس نے بیٹے کے پاس جانے کے بجائے اس کے نام خط بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ تا کہ وہ خط پڑھکر آرزومند ماں کا درشن کر سکے۔

بازار سے خط لیکر جب وہ ہسپتال کے گیٹ کے اندر آیا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ تو دوسری کے بعد تیسری سیڑھی پڑھتے ہی اسے ٹھوکر لگی، قریب تھا کہ

وہ گر جاتا، اچانک ایک نوجوان نے پیچھے سے آکر اسے پکڑ لیا اور سیدھا کر کے اسے سرتاپا بغور دیکھا اور پھر سہارا دے کر اوپر لے آیا۔

''بابو جی! میں آپکا نہایت ہی مشکور ہوں'' اس نے سادگی سے کہا ''آپ نے مجھ بیکس کو سہارا دیا خدا آپ کو اس کا اجر دے''۔

بوڑھے کی زبانی بابو جی سن کر نوجوان اپنا آپ اس انداز سے جائزہ لینے لگا۔ گویا وہ اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ کیا میں واقعی بابو جی ہوں؟

وہ بادامی رنگ کا قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں پر عینک لگی تھی اور ہاتھ میں ہینڈ بیگ۔

اوپر لان میں پہنچکر بوڑھا تھوڑی دیر دم سنبھالنے بیٹھ گیا جونہی اسنے بابو جی کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کرنا چاہا تھا اسے خط لکھوانے کا خیال آیا اور وہ انکساری سے اسکی طرف بولا۔

''بابو جی! اگر فرصت ہو تو میرے لئے ایک خط لکھکر دیجئے .... میرے بیٹے کے نام'' ! اس کے انکسار نے نوجوان کے لئے کسی عذر کی گنجائش نہ چھوڑی اور خاموشی سے خط لکھنے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں طرف سے خاموشی رہی پھر بابو جی قدرے ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''کیا لکھنا ہے خط میں؟''

بوڑھا چونک سا گیا اور بولا ''خط میں لکھنا ہے'' کہہ کر بوڑھا خاموش ہوا اور جیب سے خط نکال کر بابو جی کے ہاتھ میں دیکر بولا ''لکھئے نور چشم!''

''نہیں ایسے نہیں'' اس نے تعرض کرتے ہوئے کہا۔ ''تم پہلے مجھے وہ سب کچھ بتاؤ جو تمہیں خط میں لکھنا ہے پھر وہ سب باتیں ایک ترتیب کے ساتھ خط میں

لکھوں گا سمجھے؟!''

بوڑھا وقفہ بھر خاموش رہا اور کچھ سوچ کرتا سفانہ انداز میں بولا

''دیکھو بیٹا! خط اس طرح لکھنا، میرے بیٹے! غالباً نصف صدی کے بعد آج میں اور تیری ماں اس مقام پر لوٹ آئے ہیں۔ جہاں پر ہم نے اپنی حیات اور زندگی کا رنگین و دلفریب زمانہ گذارا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس دنیا میں تیرا وجود ہی نہ تھا مگر'' کہتے ہوئے اس کی آواز بھر آئی اور وہ خلاء کی طرف اپنی نگاہیں دوڑا کر کچھ سوچنے لگا

''اچھا اب آگے بتائیے''!

بوڑھا چونک سا گیا اور بولا''! لکھ دو کیا کہہ رہا تھا میں؟

''تم نے کہا یہ وہ زمانہ تھا جب اس دنیا میں تیرا وجود ہی نہ تھا مگر......''

مگر اس وقت بھی ہمارے دلوں میں تمہاری تمنا موجزن تھی۔ آج تمہارے والدین کی نگاہیں یہاں کے اس ماحول میں اس ماضی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ جس میں ہمیں اولاد کی تمنا تین دن کا چین اور رات کا آرام حرام کئے ہوئے تھے۔ خدا نے ہمیں وقت بروقت اولادوں سے نوازا مگر ان کا داغ مضارقت دینا آج بھی ناسور بن کر ہمارے دلوں کو گھائل بنا رہا ہے۔ اس ناسور کے صرف تم ہی مراہم تھے۔ مگر تم نے ہمارے ناسور بھرے دلوں کو ہر قدم پر تڑپایا اور ہم سے جدا رہتے ہوئے جدائی کے نشتر سے ہمارے صابر کلیجوں کو کریدا۔ اس کے باوجود بھی ہم تجھے یاد کرتے ہیں۔

ویسے ہمیں اس بات کا احساس ہے آج کل کی مصروف زندگی میں کسی کے لئے وقت نکالنا شرافۃ پڑے سنا ہمار کو ہنانے کے برابر ہے۔ خاص کر ایسے وقت

میں جب نیا جوڑا نیا گھر بنا رہا ہو، تمہاری والدہ اگر چہ دق کی مریضہ ہو کر ہسپتال میں پڑی زندگی کے آخری ایام......نہیں نہیں!

بوڑھے نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا اور اسی طرح ہاتھوں سمیت گھٹنوں پر رگڑنے لگا۔ بوڑھے کی حالت دیکھ کر نوجوان بابوجی مضمحل پریشان اداس اور نہ جانے کیا کیا ہوا۔ اس وقت اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا ایسا کہ وہ انگاروں پر بیٹھا تھا اور خود کو کوس رہا تھا ملامت کر رہا تھا۔

اتنے میں بوڑھے نے قمیض کے دامن سے آنسو پونچھ لئے اور دبی آواز میں کہا۔ معاف کرنا میری خاطر تمہیں دیر ہو رہی ہے۔ اچھا تو کیا کہہ رہا تھا میں؟!

''اور زندگی کے آخری ایام......''

''ہاں! تمہاری ماں اگر چہ وہ زندگی کے آخری ایام پورے کر رہی ہے۔ پھر بھی اسے تمہیں دیکھنے کی ایسی ہی چاہت ہے جیسی موسیٰ کو کوہ طور پر خدا کے جلوے کی چاہت تھی موسیٰ نے خدا کا جلوہ کوہ طور پر دیکھا اور ایک مریض ماں اپنے خدا کا درشن ہسپتال میں کرنے کی آرزومند ہے۔ اور اگر تم نے ماں کی تمنا کی لاج رکھدی تو......تو میں؟'' وہ ایکدم خاموش ہوا۔ اسکے چہرے پر مایوسی کی ایک ایسی لہر دوڑی جو اس کے چند یوم پہلے کے واقعہ کی غمازی کرنے لگی۔

وہ اس انداز سے خاموش ہوا جیسا کہ وہ کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت اس کے خاموش گھمبیر چہرے سے جو مایوسی اور پریشانی مترشح تھی۔ وہ اس کے ماضی کو اجاگر حال کو آشکارا اور مستقبل کی تشہیر کر رہی تھی گو وہ ماضی اور مستقبل سے

بے خبر نہ جانے کیا سوچ رہا تھا...... یکا یک اس نے گردن اٹھائی اور ایک مخصوص سمت کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''دیکھو بیٹا! آپ کو میں نے تکلیف دی خیر!''

کہکر وہ خاموش ہوا لیکن جلد ہی بولا اچھا کیا کہہ رہا تھا میں......''

''اور اگر تم نے ماں کی تمنا کی لاج رکھی تو میں......''

''ہاں جب تم یہاں ماں کے درشن کے لئے آؤ گے تو تمہارے ساتھ اگر دفتر کا کوئی آدمی ساتھ ہو گا تو ......تو میں''۔ بوڑھا خاموش ہوا پھر اس کے چہرے کا رنگ فق سا ہوا۔ پھر اس پر سکتہ سا طاری ہوا۔ اب کی بار اس کے ہونٹ لرزتے لگے ......لرزتے ہونٹوں نے پلکوں کو ڈھانپ لیا آنسو کی دو بوندیں اس کے دامن پر ایسی پڑیں گویا زندگی کے دو ساتھی ایک منزل سے نکل کر دوسری منزل پر جا پہنچے۔

بوڑھے کی اس حالت زار پر نوجوان پچھتا رہا تھا کہ اتنے میں بوڑھے نے جھٹ اس انداز سے آنکھیں کھولدیں گویا وہ کوئی سپنا دیکھ کر جاگ اٹھا تھا اس کے بدن میں جھرجھری سی آئی اور ترنت لہجے میں بولا'' کیا کہہ رہا تھا میں'' نوجوانوں نے پہلے زبان سے ہونٹوں کو تر کیا پھر بولا۔ ''دفتر کا کائی آدمی ساتھ ہوگا تو.....تو میں......!

''تو میں کہیں چھپ جاؤں گا تا کہ ......!'' بوڑھا خاموش ہوا اور گردن جھکا کر آہیں بھرنے لگا۔

نوجوان بابو جی اس سے بار بار کچھ کہنا پوچھنا چاہتا تھا مگر الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی ادھیڑ پن میں تھا کہ بوڑھے نے اس کے اضطراب کو محسوس کیا اور خفیف سا منہ بنا کر بولا۔

''دیکھو بیٹا! آپ سوچتے ہوں گے میں یہاں کس بلا میں پھنس گیا ہوں مجھے آپ

کے وقت کا ضرور احساس ہے مگر دراصل یہ میرا نہیں بلکہ میرے بڑھاپے کا قصور ہے"

"اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا اور لمحہ بھر کے بعد بولا۔"میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔میں نے زندگی بھر ان کا ساتھ نبھایا۔میری سات اولادیں ہوئی ایک حیات رہا وہ بھی اپنا نہ رہ سکا۔زمانہ بدل گیا اس کے ساتھ رشتے ناطے بھی بدل گئے۔ہمارے زمانے میں اگر کوئی پوچھ لیتا، آپ کا باپ کون ہے تو ہم فخر سے اپنا اصلی باپ دکھاتے!"

"اصلی سے تمہارا کیا مراد ہے؟!" بابو جی نے رنجیدگی سے پوچھا

مراد...... مراد تو بس یہ ہے کہ اس سادگی کے زمانے میں اگر کسی کا باپ بوڑھا ہو جاتا تھا تو وہ بزرگ کہلاتا تھا۔مگر آج، آج کل کے تعلیم یافتہ فیشن پرست نوجوانوں کے سامنے بزرگ نہیں بلکہ بوجھ کہلاتے ہیں۔اب اگر بوڑھا ذلیل ہو چکا ہے وہ اولاد کی طفیل سے ہی ذلیل کیوں نہ ہوا ہو تو وہ گھر کا مالک نہیں بلکہ نوکر کہلاتا ہے؟!"

"میں کچھ نہیں سمجھا؟!"

"دیکھو بابو جی۔دراصل بات یہ ہے کہ جب میں اپنے بیٹے رشید سے یہ کہنے کے لئے دفتر گیا کہ تیری ماں سخت بیمار ہے۔اور وہ آ ہسپتال میں انڈور ہو رہی ہے۔خدانخواستہ اگر وہ ہسپتال ہی میں...... تو اس کی آتما تمہیں کہے گی، کیا کہے گی بتاؤ؟! بابو جی! اس نے مجھے تسلی دی مگر اس کے چہرے کی رنگت سے میں نے اچھی طرح اخذ کر لیا اسے میرا یہاں اس طرح اور اس حال میں آنا شاق گذرا ہے۔یہاں سے نکل کر جب میں برآمدے کی سیڑھیاں اترنے لگا کہ میرے کانوں میں ایک ایسی کربناک آواز آئی جس نے......

"کیا آواز تھی وہ! اس نے قطع کلام کیا۔

"رشید سے کوئی پوچھ رہا تھا۔یہ کون آپ سے ملنے آیا تھا؟"

''رشید نے کیا جواب دیا؟''

''رشید نے جواب دیا یہ ہمارے گھر کا نوکر ہے''۔ اب بوڑھا ہو گیا ہے اس کی اب چھٹی کرنا پڑے گی۔ کیونکہ انہیں اس عمر میں نہ بات کرنے کی تمیز رہی اور نہ ہی یہ جانتے ہیں کہاں کس طرح آنا چاہیے کہہ کر بوڑھا خاموش ہوا اور پریشان انداز میں بولا۔

دیکھ لیا بیٹا ......! آج کل کے فیشن پرست تعلیم یافتہ نوجوان، معاف کرنا بابو جی! میری زبان سے بیٹا سن کر کہیں آپ کو بھی ہتک تو نہیں ہوتی کیونکہ میں ہاں میں بوڑھا کھوسٹ......

''نہیں! نوجوان بابو جی گلو گیر آواز میں بولا۔ اس قت اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور لرزتے ہونٹوں سے وہ بولا۔'' مجھ...... مجھے معاف کردو......؟ پاپا! ے بخش دو''!

بوڑھے کی گردن یک لخت بابو جی کی طرف اٹھ گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن پر مریض بیوی کی آواز گونجی ''میں نے کہا تھا نا، میری آنکھ دکھتی ہے'' میری بھی آنکھ دکھتی تھی۔ اس نے زور سے آنکھوں کو مسلتے ہوئے کہا مگر اس طرح اس کی کمزور بینائی والی آنکھوں میں بینائی تیز ہونے کے بجائے اور تاریکی چھا گئی۔

''مجھے معاف کردو پاپا!'' اس کے کانوں میں یہ ایک خاص لوچ دار آواز کتنے عرصے بعد آئی اور اس آواز سے وقعتاً شفقت پدری عود کر آئی۔

وہ بے تحاشا اٹھ کھڑا ہوا اس نے دونوں باز و پھیلائے البتہ وہ سر سے پاؤں تک ایسا کانپنے لگا گویا ایک باپ بیٹے سے نہیں بلکہ ایک نوکر اپنے آقا سے گلے ملنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

جہاں انسان دفن ہے

پروفیسر بھان اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی اکلوتی بیٹی کے کل کے چوتھے جنم دن کی تقریب معمول کی طرح منانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس تقریب کیساتھ کل اسے ایک موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا تھا۔ جو موقع اس کے کالج کے پرنسپل کے ساتھ مطابقت رکھتا تھا۔

ویسے وہ جان رہا تھا۔ پرنسپل معذور ہے۔ پرنسپل...... یکا یک اس کا رنگ متغیر سا ہوا۔ اس کے اندر سے ایک ملامت کی آواز سی گونجی، گویا کہ یہ ملامت اسے پرنسپل کی وہ روح کر رہی تھی جو اس وقت جسم سے علیحدہ ہونے کی جستجو میں تھی۔ وہ پرنسپل کے ہاں جانے کے لئے کھڑا ہوا کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔

دروازہ کھول کر اس نے پرنسپل صاحب کے ملازم کو دیکھا۔ تو اسے ایسا محسوس ہوا، گویا پرنسپل کی روح ملازم بنکر واقعی اسے ملامت کرنے آئی ہے۔

"پرنسپل صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے"۔ ملازم نے بتایا

"انہوں نے کہا ہے مجھے اس وقت آپ کے سہارے کی بہت ضرورت ہے"۔

"اچھا چلو میں ابھی آتا ہوں" پروفیسر بھان گھمبیر آواز میں بولا اور کپڑے

بدلنے کے لئے اندر چلا گیا۔

برآمدے سے اُتر کر جب وہ سڑک پر آیا تو ایکبار اس نے پیچھے مڑ کر اپنی کوٹھی کی طرف دیکھا اور پھر تیز قدموں سے چلنے لگا اس طرح چلتے ہوئے اس نے چند ایک گز کی مسافت ہی طے کی تھی کہ وہ رک گیا۔ اس انداز سے رگ گیا گویا پرنسپل صاحب اس سے کوئی شکایت کر رہا تھا۔

وہ پھر چلنے لگا اور چلتے چلتے پرنسپل کو یاد کرنے لگا جو اسے زندگی آخری سہارا جان کر اسے طلب کر رہا تھا۔

''آہ! میرے شفیق یار! بے رحم موت تجھے ہم سے جدا کر رہی ہے اور اس جدائی کے سمے میں کتنا سنگدل بن کر تجھ سے علیحدہ ہو کر بیٹھا ہوں۔'' پروفیسر بھان راستہ چلتے ہوئے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا اور پرنسپل کے ساتھ اس کے کردار کو یاد کر رہا تھا۔

پرنسپل ساگر کا اصلی نام عبدالکریم خان تھا۔ لیکن وہ ساگر پنجابی ہی لکھا کرتا تھا۔ اور لوگ بھی اسے پنجابی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس نام کے ساتھ اسے انس اس وجہ سے تھا کہ ساگر بنا کسی مذہب وملت اور قوم کے ہر ایک کو سیراب کرتا ہے۔ اس کا پانی ہر ایک کے کام آتا ہے۔ اس نے اپنے اصلی نام کے ساتھ اپنا مذہب بھی بھلا دیا تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ کالج کے پروفیسر، لکچرار، ڈمانسٹریٹر اور طلبا اسے کیمونسٹ کہا کرتے تھے وہ کیمونسٹ تھا یا نہیں البتہ دین دار اور مذہب پرست بھی نہ تھا۔ وہ ان دیکھی دنیا کی باتوں کا بالکل قائل نہیں تھا وہ اس چیز اور ذات کو ماننے سے بالکل انکار کرتا تھا، جس کا کوئی وجود نہ ہو۔ وہ بغیر

دلیل کے کوئی بات آسانی سے ماننے کے لئےتیار نہیں ہوتا تھا۔

وہ فرشتوں دیوی دیوتاؤں کو خیالی چیز جانتا تھا۔قسمت ماننے سے منکر تھا۔ خدا کے وجود پر شک ضرور کرر ہا تھا۔ جنت وجہنم کو خیالی مانتا تھا۔ مذہبی پیشوا اس کے سامنے وہ ایجنٹ تھے جو اپنے آپکو خدا کا نمائندہ بنا کر لوگوں کو اپنے پھندے میں پھنساتے ہیں۔عبادت کو وہ وقت ضائع کرتے سے تعبیر کرتا تھا اپنے عقائد میں غلو کے باوجود وہ نرم دل ، کم گو، انصاف پسند اور غریب پرور بھی تھا، وہ تنہائی پسند تھا۔خرچ سے زیادہ آمدنی ہونے کے باوجود بھی اسے روپے جمع کرنیکی جتنی نفرت تھی اتنا ہی ان پلیوں کو صحیح مصرف میں لائینگی فکر بھی دامنگیر رہتی ۔اپنی بچی ہوئی آمدنی سے کئی غریب لڑکوں لڑکیوں کے تعلیمی مصارف برداشت کرتا تھا۔وہ آستانوں، مسجدوں اور مندروں کی تعمیر میں چندہ دینے کے بجائے بھوکوں کو روٹی کے لئے پیسے دینے کو ترجیح دیتا تھا۔سگریٹ بہت پیتا تھا۔اپنے لباس اور رہن سہن میں ہمیشہ سادگی برتتا تھا۔دوست پرور ہونے کے ساتھ مہمان نواز بھی تھا ہر ایک کے ساتھ خلوص ونرمی سے پیش آتا تھا۔ ہر ایک کا احترام کرتا تھا۔البتہ ان لوگوں سے بیزار تھا جو بادل کے بجائے خدا سے بارش مانگتے ہیں جو انسانوں کو چھوڑ کر بھگوان سے حاجت طلب کرتے ہیں جو جھونپڑیوں کے بجائے مسجد، مندر اور دھرم شالہ کی طرف جاتے ہیں۔

پروفیسر بھان نے پہلا موڑ کاٹا اور اپنی رفتار سے چلتا رہا

اچانک اس کی نظر جامع مسجد کے مینار اور پھر پھاٹک پر پڑی ۔وہ ایک دم رک گیا۔جامع مسجد سے نگاہیں ہٹا کر وہ ادھر ادھر اس طرح دیکھنے لگا گویا وہ کسی کی

تلاش کر رہا تھا۔ لیکن اسے جلد ہی یاد آ گیا۔ میری بیٹی کا م جنم دن کل ہے اور کل ہی وہ...... مگر پرنسپل......؟

وہ آگے بڑھا پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ پرنسپل کی حرکات کو یاد کرنے لگا۔

آج سے تین سال قبل پروفیسر بھان اپنی بیٹی کی ولادت کی خبر سنکر گھر جا رہا تھا تو اسی جامع مسجد کے قریب پہنچ کر اس نے پرنسپل ساگر کو بھیس بدل کر لوگوں کی نظروں سے چھپ کر جامع مسجد کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا پھر اپنی بیٹی کے پہلی اور دوسری جنم دن کی تقریب کے موقع پر بھی اس سے اسی حالت میں دیکھا تھا پہلی بار تو پروفیسر زیادہ دنگ رہ گیا تھا۔ اس سے یہ بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ جو شخص لا مذہب اور بے دین مشہور ہو، جو مسجد اور مندر کے بجائے کسی کارخانے یا عجائب گھر میں جانے کو ترجیح دیتا ہو وہ لوگوں کی نظروں سے چھپ کر اور بھیس بدل کر جامع مسجد میں کیوں جاتا ہے اور جا کر وہاں کیا کرتا ہے؟

اگر اس روز اسے جلدی نہ ہوتی تو وہ ضرور جامع مسجد کے اندر جا کر دیکھ لیتا کہ پرنسپل یہاں کیا کرتا ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا۔ چاہئے کچھ بھی ہو کل وہ پرنسپل کے سامنے اس بات کا ضرور تذکرہ کرے گا۔

دوسرے روز اسے چوک میں پرنسپل ملا تھا۔ خیر و عافیت کے بعد دونوں کالج کی طرف جا رہے تھے کہ ایک بھکاری آیا اور ہاتھ پھیلا کر بولا

"خدا کے لئے ایک پیسہ دیدو، دو دن کا بھوکا ہوں۔"

پرنسپل ماتھے پر شکن لا کر بولا تھا۔ "تو دو دن کا بھوکا ہے یا تیرا خدا بھوکا

ہے''؟ بھکاری اس کا مطلب سمجھا نہیں اور پرنسپل نے اس سے کہا تھا''۔ اگر تم بھوکے ہو تو اپ نے لئے روٹی کیوں نہیں مانگتے۔ خدا کے لئے کیوں مانگتے ہو! تنا کہہ کر اس نے جیب سے نہ جانے کیا اور کتنا نکال کر بھکاری کے ہاتھ میں تھما دیا۔

پروفیسر بھان اسے دیکھ رہا تھا اور اس طرح دیکھ رہا تھا گویا وہ جاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ بھکاری کی زبانی خدا کا نام سنکر غصہ ہونیوالا پرنسپل سا گروہی تو نہیں جو ایک مقررہ وقت اور تاریخ پر خدا کے گھر میں داخل ہوتا ہے۔

''بھان صاحب کیا سوچ رہے ہیں''؟ پرنسپل نے پوچھا تھا قریب تھا کہ وہ کوئی جواب دے پرنسپل خود ہی بولا تھا۔

''دیکھ لیا خدا کو پیسے کی فردرت پڑی تھی۔ کیونکہ اسے بھوک لگی تھی۔''

''تو کیا......، میرا مطلب ہے آپ خدا کے وجود کے قائل ہیں۔''

''خدا کے وجود سے کون انکار کرتا ہے، کیا یہ ہمارے سامنے ہاتھ پھیلائے خدا نہیں اتھا۔''

''آپ کا اشارہ بھکاری کی طرف ہے؟''

''یہ بھکاری نہیں یہ اس دھرتی کا خدا ہے بھان آپ مجھ سے اتنے قریب رہتے ہوئے میری باتوں کو نہیں سمجھتے۔''

''لیکن ایک انسان کو خدا کہتے ہوئے آپ......

''خدا کی توہین کرتے ہیں......یہی کہنا چاہتے ین نا آپ؟'' اس نے قطع کلام کیا تھا۔ پروفیسر نے اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا تھا اور پھر......پھر

وہ چند قدم آگے بڑھا کر بولا تھا "پرنسپل صاحب! میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں برا تو نہ مانیگے؟"

"میں نے آج تک کسی کی کوئی بات بری مانی ہے کیا؟ چاہتے وہ بری ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ وہ شخص ذرا برا لگتا ہے۔ جو آج کی بات کل کہے اور مستقبل کی بات حال میں پوچھے"۔ پروفیسر بھان اس کے اس انکشاف سے دنگ رہ گیا تھا۔ پھر بھی وہ پرنسپل کے سامنے جامع مسجد والا قصہ دہرانے کی جرات اپنے آپ میں پیدا کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک برقعہ پوش عورت پرنسپل کے سامنے کھڑی ہو کر بولی تھی۔

"میں آپ سے ایک عرض کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں اسے ایک حکم کا درجہ دوں گا۔" پرنسپل نے کہا تھا۔ "بشرطیکہ وہ اس لائق ہو۔"

"لائق ہی تو ہے جناب! کاش ......" اس کی آواز بھیگ سی گئی تھی اور پھر بھرائی آواز میں بولی تھی۔ "خدا کے سوا میرا اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ بارہ سال سے بیوگی کی زندگی گذار رہی ہوں، میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ خدا سے منتیں مان کر مانگا ہے۔ اسی کے سہارے جی رہی ہوں تا کہ وہ کچھ لکھ پڑھ کر کسی کام کے لائق بن جائے۔ لیکن جناب......!"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔ مطلب کی بات بتاؤ" پرنسپل نے پوچھا تھا۔ وہ بولی تھی۔

"جناب! میرا بیٹا آپ کے کالج میں پڑھتا ہے۔ پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ میں اس کے لئے کتابوں کپڑوں، اور فیس وغیرہ کے لئے مشکل سے پیدا کر رہی تھی کہ اس کے سر پر امتحان اور میرے کندھوں پر اس امتحان کے فیس کا بار

آپڑا۔اب خدا کے لئے آپ ہی ہماری مدد کیجئے ۔ کہاں سے اتنی بڑی رقم لے آئینگے۔''

''دیکھئے آپ بجا فرماتی ہیں ...... مگر اس فیس کے ساتھ ہمارا اتنا تعلق نہیں جتنا کہ یونیورسٹی کا ہے۔اگر کالج کی فیس ہوتی تو ہم معاف کر دیتے۔''

''جناب آپ ہی ہمارے حاکم ہیں خدا کے لئے کچھ کیجئے ورنہ میرا بیٹا اس سال امتحان میں بیٹھ نہیں سکے گا۔خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔''

''میں اس بارے میں معذور ہوں ۔میرے لائق اور کوئی حکم ہو تو بجالاوں گا''۔اتنا کہکر وہ آگے بڑھا چند قدم آگے بڑھتے ہی پروفیسر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

''آپ اس عورت کو جانتے ہیں؟''

''نہیں تو'' اس نے لاپرواہی سے جواب دیا تھا۔ پروفیسر نے کہا تھا

''اگر آپ اس کو کچھ دیتے تو میں آپ کو روک دیتا، یہ ایک بدکردار عورت ہے دیکھو زبان سے کیسی شریف لگتی تھی۔''

''پرنسپل ایکدم رک کر اشتیاق سے بولا تھا۔آپ اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں''۔

''اس کو کون نہیں جانتا یہ تو ایک مشہور طوایف ہے۔یہ اس کا اپنا بیٹا نہیں ہے اس نے دوشیزگی میں بچہ نہ ہونے کی دوائی کھائی تھی ۔ اب پیشہ سے توبہ کیا ہے۔لیکن پچھلے کئے کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔''

''کیا یہ سب بالکل صحیح ہے ۔ پرنسپل مضطی خیز نظروں سے دیکھ کر بولا تھا۔

''تو کیا آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں''۔

''اگر یہ بات ہے تو...... پھر تو میں نے بہت غلطی کی، چلو آؤ میرے ساتھ ہم اس کو ڈھونڈتے ہیں۔''

کس لئے؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔قریب تھا کہ پرنسپل کچھ بتا دیتا اس نے کالج کے ایک طالب علم کو آتے دیکھ کر اپنے پاس بلا کر اسے اس برقعہ پوش عورت کر لے آنے کے لئے بھیجدیا تھا۔

پرنسپل کے سامنے جب دوبارہ وہ عورت کھڑی ہوئی تو اس نے پوچھا تھا۔''کیا تمہارے پاس فیس کے لئے واقعی کوئی روپیہ پیسہ نہیں ہے۔''

''میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں اگر میرے پاس اتنی بڑی رقم ہوتی تو میں کسی کے سامنے امدا کی درخواست نہیں کرتی۔''

''کتنے روپیوں کی ضرورت ہے۔اسے؟''

''وہ پچھتر روپے مانگ رہا ہے۔میں نے اس سے کہدیا میں کہیں سے ادھار لے آؤں گی۔لیکن جب ادھار میں مجھے ایک روپیہ بھی نہیں ملا۔تو میں نے فیس معاف کرانے کی غرض سے ادھر کا رخ کیا۔

''دیکھو میں نے پہلے بھی کہا ہے۔یہ یونیورسٹی معاملہ ہے۔رہا فیس کا سوال میں اس وقت صرف پچاس روپے دے سکتا ہوں اور باقی چار بجے کے بعد میرے ڈیرے پر مجھ سے حاصل کئے جا سکتے ہیں''۔اتنا کہہ کر وہ جیب سے پرس نکال کر اور جیبوں کی تلاشی لے کر پچاس روپے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تھا۔''

دیکھئے یہ روپے میں آپ کو نہ بطور امداد دیتا ہوں اور نہ ہی بطور قرض بلکہ ایک فرض

جان کے دے رہا ہوں۔ لیکن آپ اپنے بیٹے کو یہی کہہ دینا میں یہ ادھار لے آئی ہوں۔ جب بڑے ہو کر تم کمانے لگو گے تو میں یہ قرض چکا دوں گی۔ سمجھی؟''

''خدا آپ کو بہت بہت ترقی دے۔''

''اور آپ کو کبھی روپے پیسے کی ضرورت پڑے تو بلا دریغ میرے پاس آجانا!''

پرنسپل کی اس حرکت پر پروفیسر بھان نہ صرف محو حیرت تھا بلکہ وہ ان کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ نیک کردار پرنسپل نے کس غرض سے اس عورت کو اتنے روپے دیئے اگر اس میں کوئی غرض وابستہ ہے تو میرے روبرو دینے کا مطلب کیا، اور میری زبان سے اس عورت کی برکرداری سن کر ہی اتنے روپے دینے کے لئے کیوں تیار ہوا۔ پہلے جب وہ ایک انجان عورت کے روپ میں اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی تو اس نے اس کو خالی ہاتھ واپس کر دیا تھا۔ اور جب...... ایک بدکردار عورت کو اتنے روپے دینے اور ضرورت پڑنے پر اس کو بے تکلف اپنے ہاں بلانے میں اس کی کیا غرض ہے۔ کہیں اس کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ تو نہیں ہے''۔

''بھان صاحب کیا سوچ رہے ہیں؟'' پرنسپل نے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر پوچھا تھا۔ اور پروفیسر تیور بدل کر بولا تھا۔

''کیا آپ کو اس بات کا کامل یقین ہے کہ اس نے جو کچھ بتا دیا سچ ہی تھا''۔

''بشیر طیکہ وہ بدکردار عورت ہو، آپ شاید یہ نہیں جانتے ہیں۔ ایک بدکردار عورت یا مرد جو لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو جو اپنی نظروں میں گنہگار ہو جھوٹی قسم کھانے سے اس طرح پرہیز کرتا ہے۔ جس طرح خدا کے وجود سے انکار کر

نے والا جھوٹ سوٹ خدا کی قسم کھانے سے احتراز کرتا ہے۔" اتنا کہکر وہ خاموش ہو گیا تھا دونوں خاموشی سے کالج میں داخل ہوئے تھے۔

پروفیسر بھان نے دوسرا موڑ بھی طے کیا اور اپنی رفتار ذرا تیز کر کے چلنے لگا۔ وہ پرنسپل کے ساتھ اس کے عادات وخصائل کو یاد کر رہا تھا۔

ساگر پنجابی جتنا ہی مذہبی معاملوں میں بد اعتقاد تھا۔ اتنا ہی ذہین سمجھدار اور عالم بھی تھا۔ متعدد باتوں میں اس کے ساتھ اختلاف ہونے اور اس کی بعض ہٹ دھرم حرکتوں سے بیزار ہونے کے باوجود بھی ہر ایک اس کی عزت اس کا احترام کرتا تھا۔ وہ ہر ایک سے خلوص ونرمی سے پیش آتا تھا۔ اپنی فکر کے بجائے اسے ہمیشہ دوسروں کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ وہ سیاست سے خاص دلچسپی لیتا تھا اور ادب سے زیادہ اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ تنہا پسند رہا۔ ساٹھ سال گزرنے کے باوجود بھی اپنے آپ کو شادی بیاہ کے قابل نہیں سمجھتا، کرایہ کے مکان میں رہائیش کرتا ہے۔ ایک ملازم کو کھانا پکانے کے لئے رکھ لیا جس کو اپنے بھائی کی طرح اپنے ساتھ رکھ کر فرصت کے وقت اسے لکھاتا پڑھاتا بھی ہے۔ اگرچہ دوست واحباب کا حلقہ وسیع نہیں ہے۔ پھر بھی صبح شام اس کے ہاں دو چار افراد ضرورت ہوتے ہیں۔ پروفیسر بھان کے ساتھ ایک خاص لگاؤ ہے اور پروفیسر بھان بھی نہ صرف بحیثیت پرنسپل اس کا کافی احترام کرتھا تھا۔ بلکہ ایک نیک ساتھی جان کر بھی اس کی بہت قدر کرتا ہے۔

اس روز بھی جب وہ چار بجے کے بعد پرنسپل کے ہاں گیا تھا تو اس نے طوائف کو دعائیں دے دے کر واپس جاتے دیکھا تھا۔ اندر آکر جب وہ پرنسپل

کے قریب بیٹھا تھا تو کافی جرات کے ساتھ پوچھا تھا۔

''کیا اس نے وہ باقی روپے لے لئے''

''تو کیا آپ کا مطلب ہے میں صرف وعدہ کرتا ہوں۔''

''نہیں دراصل میں......میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہون کہ......

''خیر میں آپ کا مطلب بھانپ گیا''۔ پرنسپل نے زیر لب مسکرا کر قطع کلام کیا اور طویل لمحے بعد بولا تھا ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عورت کے کرتوت سے واقف ہونے کے بعد ہی میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی۔ میں آپ کے سامنے صاف طور یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ عورت نیک کردار کی مالک ہوتی یعنی طوائف نہیں ہوتی تو شاید ہی میں اس کی مدد کرتا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک بدکردار عورت کی مدد کرتے ہوئے میں خود بدکردار بن رہا ہوں نہیں یہ بات نہیں ہے۔''

''آپ جیسے نیک کردار لوگ...... بدکردار بن جائیں تو پھر اس دھرتی کے تباہ ہونے میں کونسی دیر ہے''۔

پروفیسر احترام کی نگاہوں سے دیکھ کر بولا تھا۔ ''البتہ میں آپ سے یہ بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج صبح ایک بھکاری نے آپ کو خدا کا واسطہ دیا اور آپ نے فوراً اعتراض لیا۔ لیکن ایک طوائف جس نے آپ سے پون سو روپے لئے خدا کے نام کے ساتھ اتنی دعائیں سن کر بھی آپ کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئے۔''

''آپ نے درست فرمایا......اور اگر آپ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں بتا دیتا ہوں میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے ماتھے پر شکن تک آنے نہ دئے

کیونکہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے اسے ایسی ہی تسلی ہوتی تھی جیسی کسی معتروض کو قرض کی ادائیگی سے ہوتی ہے...... رہا سوا بھکاری سے میں نے اعتراض کیوں کیا؟ میں صاف طور پر کہتا ہوں کہ مجھے اس وقت ایسا ہی کرنا چاہئے تھا کیونکہ ایسے لوگوں کی زبانی خدا اور رسول ﷺ، بھگوان اور رام دین کے واسطے سن کر مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی اتنی بھی عقل نہیں ہوتی کہ وہ جان لیتے کہ اگر ہمارے دعاؤں کی کوئی تاثیر ہوتی تو ہماری ایسی حالت کیوں ہوتی۔ کیا اس قابل بننے میں ہماری اپنی کوئی چاہت تھی۔ جو لوگ اپنے آپ کو نیک دعاؤں کے ذریعے اپنی مدد آپ نہ کر سکتے ہوں۔ بھلا وہ اپنی دعاؤں سے دوسروں کا کیا بھلا کر سکتے ہیں۔ آپ برا نہ مانئے میں وثوق سے کہتا ہوں یہ سب ڈھونگ ہے۔"

پروفیسر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس نے کچھ قائل ہونے کے بعد اپنی بات جاری رکھ کر کہا۔ "اور تو یہ لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔ اور پھر جنت و جہنم نامی کسی مرکز کا کابل یقین رکھ کر زندہ رہتے ہیں۔ اگر ان میں ذرا بھی سوچ ہوتی تو یہ سمجھ لیتے یہ سب ایک قسم کی لالچ اور ترغیب ہے۔ یہ سب پریشانی مصیبت اور دکھ کی زندگی گذارنے کے لئے ایک ڈھارس ہے۔ اور یہی پیشوان دین اور دیوتاؤں کا ایک عطیہ ہے۔ جو لوگوں کو غلامی اور غربت کی زنجیروں میں جکڑ کر امیروں کو خون چومنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

انہوں نے اپنے بھگوان اپنے باری تعالی کے واسطے سے کامیابی اور جنت کے دروازے کھولنے کے لئے مذہب اور دھرم کی آڑ لی ہے۔ انہوں نے ہی غریبوں ناداروں، بیکسوں اور زنگدستوں کو قسمت پرصابر و رضا کر رہنے کے لئے

ابدی تقدیر کا پرچار کیا ہے۔میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں۔عذاب جہنم سے ڈرنے اور جنت کے لالچ میں رہ کر ظلم سہنے، مصیبت ے دن گذارنے میں بجز اس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ غریب لوگ صبر وشکر کے ساتھ امیروں کے محتاج بنے رہیں۔یہ لوگ جسے عبادت کہتے ہیں اس کو میں ریاکاری کہتا ہوں اور جس کو یہ دین دھرم کہتے ہیں وہ فتنہ وفساد کی جڑ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، آپ تو جانتے ہیں کہ میں مذہب پرست نہیں ہوں اس کے باوجود بھی میرے سامنے مذہب ایک ایسا چراغ ہے جس سے اندھیرا دور ہوتا ہے مگر یہ چراغ اپنے تلے کا اندھیرا دور نہیں کر سکتا ہے۔اور مذہب کے بارے میں محدود نظریہ لے کر ہم سب اسی اندھیرے میں پھرتے ہیں۔مگر چراغ پھر بھی اپنی جگہ ضوفشاں ہے۔یہ چراغ اپنے اپنے وقت پر شری کرشن بھگوان عیسیٰ و موسیٰ، حضرت محمد ﷺ اور گرونانک نے درشن کئے مگر...... اتنا کہکر وہ خاموش ہوا اور طویل لمحے بعد بولا تھا۔''بھان صاحب! ان چراغوں میں جذبہ واحساس کا تیل ختم نہیں ہوا ہے۔البتہ ان پر جہالت تعصب اور تنگ نظری کی گرد ضرور جم گئی ہے۔جس کی وجہ سے اسکی روشنی کچھ ماند پڑ گئی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ لوگ جن کے لئے یہ چراغ روشن تھے اپنے قلب کے اس جذبہ واحساس کی حرارت سے غافل نہیں ہو جاتے اس روشنی کی بدولت وہ صرف اپنے ارد گرد کو ہی نہیں بلکہ کائنات عالم کو بھی دیکھ لیتے صرف اپنے ارد گرد دیکھتے رہنے اور اسی پر اکتفا کرنے کی وجہ سے ان کے سامنے ان چراغوں کی روشنی کا صحیح مقصد فوت ہو چکا ہے۔اگر ان لوگوں کو اس روشنی کو سمجھنے کی چاہت ہوگی تو میں ان کو بتاؤں گا۔آؤ......' دنیا کی طرف آنکھیں پھیلا کر دیکھو

،مذہب ، دین اور دھرم ،اخوت ،دردمندی اور انسانیت کا نام ہے محبت اور عبادت میں اتحاد اور یکسانیت کا درس ہے"۔

پرنسپل کا الکچر اسی طرح دیر تک جاری رہا۔اگر چہ وہ کم گو تھا لیکن جب کسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگتا تو پھر وہ خاموش رہنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔اور جب خاموشی سے کام لیتا تو بولنے سے گویا اسے کوئی سروکار ہی نہ ہوتا تھا۔اپنی بات منوانے میں اسے ملکہ حاصل تھا جس کسی موضوع یا مسئلہ پر بھی وہ اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا تو اسکو پایہ تکمیل تک پہنچا کر ہی چھوڑتا تھا۔بحث کے دوران وہ کبھی مشتعل نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کسی کو مشتعل ہونے دیتا۔اپنی بات دوسروں کے ذہن میں بٹھانے کا اس میں ایک خاص وصف تھا۔

پروفیسر نے کتنی بار اس کے سامنے جامع مسجد والے واقع کے انکشاف کا تہیہ کرلیا تھا۔لیکن پرنسپل اس کے چہرے سے دل کا حال جان کر اسے ایسے ٹال دیتا تاکہ پروفیسر کو چپ رہتے ہی بنتی تھی، پھر بھی اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ وقت مقررہ پر جب میں انہیں وہاں پکڑلوں گا تو اس وقت وہ کیسے ٹال دینگے۔

پروفیسر بھان نے تیسرا موڑ کاٹا اور تیز رفتار سے چلنے کے باوجود بھی وہ اس رفتار کو کافی سست محسوس کرر ہا تھا۔ پرنسپل کی حرکات کو من ہی من میں یاد کرتے ہوئے وہ جارہا تھا کہ اسکی نظر سامنے دائیں جانب کے قبرستان پر پڑی وہ ایکدن رک گیا۔لیکن دوسرے لمحے پرنسپل کی یاد کے ساتھ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر چلدیا۔

پروفیسر کو یاد آگیا۔وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے تیسرے جنم دن پر جب اسی راستے سے گھر جارہا تھا تو جامع مسجد کے قریب معمول کی طرح اس نے پرنسپل کر بھیں

بدل کر جامع مسجد کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ پرنسپل کو پکڑنے کے لئے آگے لپکا تھا مگر جتنی دیر میں وہ اس جگہ پہنچا تھا اتنی دیر میں وہ اندر گھس چکا تھا۔ مسجد کے گیٹ پر کھڑے ہو کر جوں ہی اس نے اندر جانے کا ارادہ کیا تھا۔ یکا یک اس کے تن بدن میں ایک بجلی سی کوندگئی تھی جس کی رو سے وہ مسحور ہوا تھا اور وقفہ بھر کیلئے انہیں اس لمحے کا احساس ہوا تھا۔ جس میں لوگ مسجد اور مندر کو دو جدا مرکز جان رہے ہیں۔ کیونکہ وہ مندر کا پجاری تھا۔ اس لئے مسجد کے اندر جانے کیلئے اس کی ٹانگیں صاف انکار کر رہی تھیں۔ وہ سوچ بھی چکا تھا۔ اگر مسجد کے اندر جانے کے لئے اس کی ٹانگیں رک گئیں۔ ان کی ٹانگیں اندر جانے سے رکنے سے انہیں کیسے پتہ چلے گا۔ مسجد کے اندر جا کر وہ کیا کچھ کرتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر بھان جوتا اتار کر بڑے احترام سے مسجد کے اندر آیا

اس نے پرنسپل کو دیکھا تھا۔

پرنسپل دوزانو بیٹھا ہاتھ دراز کر کے خاموشیسے کچھ مانگ رہا تھا۔ وہ کیا مانگ رہا تھا اور کس سے مانگ رہا تھا؟ اس کو پروفیسر نہ سن سکا نہ سمجھ سکا تھا۔ البتہ اندازہ ضرور کر چکا تھا کہ پرنسپل آہستہ آہستہ گریہ زاری کر رہا ہے۔

کیونکہ ان کی سسکیوں کی آواز مسجد کے دیواروں کے ساتھ ٹکرا کر ایک مدھم گونج پیدا کر رہی تھیں۔

”پروفیسر نے جونہی آگے بڑھنا چاہا، پرنسپل اٹھنے لگا تھا۔

پروفیسر جلدی جلدی باہر نکل کر ایک کونے میں چھپ گیا تھا۔ تاکہ جب وہ باہر نکلے تو وہ ان کے سامنے آجائے۔ البتہ پرنسپل عقب کے دروازے سے نکل کر

قبرستان میں داخل ہوئے تھے۔ اور ایک نامور طوائف کی قبر پر حاضر ہوئے تھے۔ پروفیسر بھان نے انہیں ایک مشہور رنڈی کی قبر پر کھڑا ہوتے دیکھا تھا پرنسپل اس قبر پر جھک گیا تھا اور شاید مغفرت کی دعائیں مانگنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ دراز کئے تھے۔

منظر دیکھ کر پروفیسر کچھ بے تاب سا ہو گیا تھا اور بغیر سوچے سمجھے وہ ایک جست لگا کر پرنسپل کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

پرنسپل نے چونک کر اسے ایک نظر سے دیکھا تھا اور پھر دوبارہ اس قبر پر وہ جھک گیا تھا۔

''معاف کرنا''! پروفیسر بھان اشتیاق اور ندامت کی ملی جلی کیفیت سے بولا تھا۔ ''میں آپ کو متواتر تین سال سے وقت مقررہ پر جامع مسجد جاتے ہوئے دیکھتا ہون مگر آج پہلی بار ایک طوائف کی قبر پر جھکتے ہوئے دیکھا ہے''۔

پرنسپل نے کھڑے ہو کر آنسو پونچھ لئے تھے اور پھر بھرائی آواز میں جھجکتے ہوئے بولا تھا۔ میرے دوست! جو شخص اپنے معبود کے آگے بھی نہیں جھک سکتا ہے۔ اسے ایک طوائف کیقبر پر جھکتے ہوئے دیکھ کر اس کے کردار پر شک نہیں کرنا اور نہ ہی اسے غلط سمجھنے کی کوشش کرنا، خیر چھوڑ دوان باتوں کو چلو چلتے ہیں۔

پروفیسر کھڑا رہا اور پھر معذرت آمیز لہجے میں بولا تھا۔

''معاف کرنا مجھے آپ پر کامل اعتماد ہے۔ اور میں نے ہمیشہ آپ کو ایک نیک بزرگ کا سا درجہ دیا ہے۔ اور آپ نے میرے دوش پر ایک دوست کا اعتماد رکھ دیا ہے''۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔'' پرنسپل نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا تھا

پروفیسر التجا کے انداز میں بولا تھا"۔میں یہ سارا ماجرا جاننا چاہتا ہوں۔مجھے امید ہے آپ میرے سامنے کوئی بھی بات چاہے وہ راز کا درجہ کیوں نہ رکھتی ہو چھپانے کی کوشش نہیں کرینگے۔"

"آپ خوامخواہ ان باتوں میں کیوں الجھتے ہیں۔"

"اگر میں الجھتا ہوں تو آپ سلجھا دیجئے؟"

ایسی کوئی بات نہیں۔آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔"

اتنا کہ کر وہ خاموش ہوا تھا اور پروفیسر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے کر بولا تھا۔

"دیکھو بھان! ہر شخص کے ساتھ ایسے کوئی ذاتی معاملات ضرور وابستہ ہوتے ہیں جن کو دوسروں کے سامنے وہ بیان یا عیاں نہیں کرسکتا ویسے یہ کوئی خاص ماجرا بھی نہیں ہے۔دارصل س بات جس کو آپ راز سمجھ رہے ہیں۔اس کو میں کوئی اہمیت نہیں دے رہا ہوں اس لئے آپ بھی اسے کوئی اہمیت مت دیجئے"

"آپ کی مرضی!" پروفیسر ناراض ہوکر بولا تھا۔اور پھر خاموشی سے چلدیا تھا اپنی راہ اختیار کرتے ہوئے یہ پراسرار ماجرا ایک معمہ کی طرح اس کے ذہن پر اٹکا رہا؟ جو معمہ حل ہوتے ہوتے ہوئے بھی حل نہیں ہوتا تھا۔اسی طرح وقت گزرتا رہا۔حالات بدلتے رہے۔بدلتے ہوئے حالات اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ روزمرہ زندگیوں میں برابر تغیرات ہو رہے تھے۔وقت اور حالات کی ا س تبدیلی کے ساتھ ساتھ پرنسپل کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔

جب سے انہیں ڈاکٹری معائنے میں پتہ چلا کہ وہ کینسر جیسی موزی بیماری کا

شکار ہوا ہے۔ جب سے ان میں زیادہ گوئی کے ساتھ تند مزاجی بھی عود کر آئی تھی۔ اب وہ معمول باتوں پر جھگڑتے تھے۔ غیر ضروری باتوں پر غصہ ہو رہے تھے۔ اس کی اس نمایاں تبدیلی سے اس سے ملنے والوں میں کوئی ناراض نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ سب جانتے تھے اب یہ مہمان ہے۔ وہ مہمان جسے موت کے فرشتے نے دعوت نامہ بھیجدیا ہے۔

پروفیسر بھان کو جب ڈاکٹر کی زبانی پوشیدہ طور پتہ چلا کہ اب انکی زندگی کی معیاد صرف دوڈھائی مہینے ہے۔ تب سے وہ ان کی تیمارداری میں ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اس تیمارداری کے دوران انہوں نے ہر بار یہی کہکر ٹال دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ خواہ مخواہ ان باتوں میں کیوں الجھتے ہیں۔ اسی طرح الجھتے اور سلجھتے حالات میں پرنسپل بستر مرگ پر دراز ہو گیا تھا۔

آخری موڑ کاٹ کر پروفیسر نے اپنی رفقاء میں بتدریج اضافہ کیا پرنسپل سے جدائی کے شدید احساس سے وہ سخت پریشان ہو رہا تھا۔ اسے اس بات کا بھی دکھ ہو رہا تھا کہ اگر میں انکی خوب تیمارداری کر رہا تھا پھر آج میں نے انہیں ملازم بلانے بھیجنے کا موقعہ کیوں دیا۔

اسی پریشانی میں وہ پرنسپل کے ڈیرے میں داخل ہوا اور پھر آداب بجالا کر پرنسپل کے بیڈ کے پاس کھڑا ہوا۔ پرنسپل نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کرسی پر بیٹھ کر پروفیسر کے دل میں ایک ہوک سی اٹھ گئی اور وفور غم سے وہ کانپ سا اٹھا۔ اس نے پرنسپل کے چہرے پر وہ اثرات دیکھے جن کے بارے میں ڈاکٹر نے اسے پوشیدہ طور بتایا تھا۔ یہ بہت جلد مرنے کی علامت ہے۔ اس

علامت کو دیکھ کر پروفیسر سخت بے چین ہوا کہ اتنے پر پرنسپل نے ان سے پوچھا۔

"کل سے آپ یہاں نہیں آئے کیا بات ہے؟"

پروفیسر نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی زبان نکل سی گئی۔ پرنسپل ایک آہ بھر کر بولا "دیکھئے بھان صاحب! اب میں شاید آپ لوگوں سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو رہا ہوں! اس قبل از وقت جدائی کا مجھے کافی دکھ اور صدمہ ہے۔ ویسے اگر میں عمر رسیدہ بھی ہوتا تو بھی مجھے اپنی موت پر یہی دکھ اور صدمہ ہوتا ممکن ہے اس وقت اسے بھی زیادہ ہوتا کیونکہ انسان کی کچھ ایسی فطرت ہے کہ دنیا اسے کتنا ہی جہنم اور دکھ کا گھر کیوں نہیں دکھاتی دیتا ہو، لیکن جب اس دنیا سے بچھڑ جانے کی آواز اس کے وجود میں گونجتی ہے تو اسے اس کا جتنا بھی دکھ اور صدمہ ہوتا ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں کوئی انتہا نہیں۔ کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو بے خبری میں مرتے ہیں اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا لیکن جلدی ہی بولا۔

"میں وثوق سے کہتا ہوں جو لوگ زندگی سے تنگ آ چکے ہوں خودکشی کی حد تک پہنچتے ہوں اگر انہیں اس گھڑی کے غم دکھ اور صدمہ کا کچھ احساس ہوگا تو وہ ہرگز موت کا نام نہیں لینگے۔ حالانکہ موت کا ایک دن معین ہے اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ مجھے جینے کی کوئی ہوس نہیں تو یہ میں سراسر جھوٹ کہوں گا۔ اس لئے کہ مجھے جینے کی ہوس ہے اور میں تو یہ بھی جانتا ہوں اب میں زیادہ دنوں تک جی نہیں سکوں گا۔ وہ پھر خاموش ہوا اور پانی کا صرف ایک گھونٹ حلق سے اتار کر بولا

"ویسے اگر میں اس دنیا میں جینا چاہتا ہوں تو محض کل دن کے لئے کیونکہ اس دن کی جتنی اہمیت میرے لئے ہے اتنی زندگی بھر کے کسی دن کی نہیں ہے۔ آپ تو

جانتے ہی ہیں۔اس روز میں جامع مسجد سے نکل کر قبرستان جاتا ہوں۔"

"کیا کرنے جاتے ہیں؟ پروفیسر نے فوراً پوچھا۔

"میں کیا کرنے جاتا ہوں؟ یہ دوسری بات ہے۔پہلی بات جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ......

"کیا ہے وہ؟" اس نے اشتیاق آمیز لہجے میں قطع کلام کیا۔

"میں بتاتا ہوں۔" اس نے کہا اور پھر پہلو کے ساتھ تیور بھی بدل کر بولا

"دیکھو بھان! مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے اور اس بھروسے کے تحت میں مرنے سے پہلے آپ پر ایک ایسی ذمہ داری ڈالنا چاہتا ہوں۔جس ذمہ داری کو زندگی بھر آپ کو نبھانا ہے۔اگر آپ یہ بوجھ اٹھا سکو گے تو میں آپ کو اس ذمہ داری سے آگاہ کروں گا۔"

"اور میں ذمہ داری کے ساتھ اگر آپ مجھے اس......" پروفیسر خاموش ہوا اور پرنسپل اس کا مطلب بھانپ کر بولا۔"آپ جس راز سے واقف ہونا چاہتے ہیں میں وہی ذمہ داری آپ پر ڈال رہا ہوں۔آپ عالم ہیں اور میرا خیال ہے آپ ایک عالم کی ذمہ داری کی خوب قدر کر سکیں گے!"

"میں یہ ذمہ داری نبھانے کا وعدہ کرتا ہوں۔" پروفیسر نے جوش میں آکر اپنے ہاتھ کو آگے بڑھایا اور پرنسپل نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مجھے آپ سے یہی توقع ہے۔" اس کے بعد کمرے میں تھوڑی دیر تک خاموش رہی اور پھر پرنسپل سکوت توڑ کر بولا۔"آپ تاریخ اور وقت جانتے ہیں۔ اس تاریخ اور وقت پر آپ کو ہر سال جامع مسجد جانا پڑے گا۔اور جامع مسجد سے

نکل کر قبرستان جا کر اس جگہ پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ جہاں میری ماں کی قبر ہے
پروفیسر نے اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور پوچھا
''لیکن وہ......وہ آپ کی ماں کہاں ہے؟ وہ تو......
''وہ ایک رنڈی۔ یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ!'' پرنسپل نے اس کی بات پورا کرتے چھوڑ دی اور کہا۔ ''بھان صاحب! آپ اسے میری ماں ہی سمجھ لیجئے میں تو اسے ایک ماں کے علاوہ ایک دیوی بھی سمجھتا ہوں۔ اور اسی دیوی کی روح کو سکون پہنچانے کے لئے میں اپنی زندگی کے بعد اپنی یہ ذمہ داری اپنا یہ قرض آپ پر ڈال رہا ہوں۔ اور اگر ہو سکے تو آپ بھی اپنی زندگی میں مرنے سے قبل میری طرح کسی ایسے شخص پر جس پر آپ کا پورا وشواس ہو، ان سے یہ فرض نبھانے کا وعدہ لینا''
''میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن مجھے یہ تو بتایئے آپ اتنی بڑی قربانی کیوں اور کس لئے دے رہے ہیں؟''
''کاش میں یہ قربانی دے سکتا!'' پرنسپل افسردگی سے بولا اور پھر اپنے ماضی کو جھانکنے لگا۔ ماضی سے نگاہیں ہٹا کر جب اس نے اپنے حال کو دیکھا تو بستر ہ میں ہی تکیہ کے ساتھ ٹیک لگا کر بولا۔
''یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ میری سغر سنی میں میری ماں مر چکی تھی۔ میرے والد ایک صوفی منش آدمی تھے۔ انہیں اپنے مذہب کی بہت عقیدت تھی۔ مذہبی معاملوں میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ یہاں تک کہ جب علاقے میں ہندو مسلم فساد ہوا تو اس میں بھی وہ آگے رہ کر قتل ہوئے، اپنے ساتھیوں نے اسکی قبر پر شہید محمد الطاف خان تو لکھدیا مگر میں اسے شہید کے بجائے مقتول ہی مانتا

ہوں اور اسی مقتول باپ کے بچھڑ جانے کے بعد میرا ایک چچا کے سوا کوئی آسرا نہیں رہا۔ پہلے پہل چچا اور چاچی نے میری خوب خاطر و مدارت کی مگر رفتہ رفتہ جب وہ مجھے ایک بوجھ سا محسوس کرنے لگے تو میں نے ننھال کا رخ کیا۔ وہاں پر جب تک میرے سر پر دادی اماں کا سایہ رہا میں نے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں کی لیکن اس کے رحلت فرمانے کے بعد جو سلوک ممانیوں نے میرے ساتھ روا رکھا اس کو بیان کرنا میں اس وقت غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ پھر بھی آٹھویں جماعت پاس کرنے تک میں وہیں رہا"۔ کچھ توقف کے بعد وہ پھر بولے

"میری طبیعت پہلے سے ہی کچھ ایسی تھی کہ میں ناخوشگوار کی نعمت پر خلوص کی سوکھی روٹی کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں کبھی بھی اپنے رشتہ داروں کے ہاں مانگ کر نہیں کھاتا تھا۔ اگر وہ کھلاتے تھے تو میں عذر نہیں کرتا تھا لیکن جب حالات روز بروز بدلتے گئے اور ان بدلتے ہوئے حالات میں جب اپنے پرائے مجھے دھکے دینے لگے تو مجھے ان کے ساتھ اپنی سٹیٹ اپنا وطن چھوڑ کے بغیر کوئی چارہ نہیں لگا"۔" اتنا کہہ کر پرنسپل خاموش ہوا او وقفہ بھی بعد بولا"۔ میں پڑھنے کا بہت شوقین تھا۔ اس لئے اپنے وطن سے بھاگ کر اپنے ساتھ کتابوں کا بستہ کے سوا کچھ نہیں لیا تھا۔ چلتے پڑتے ...... بھاگتے ہوئے جس منزل پر میں دم سنبھالنے بیٹھ جاتا تھا۔ وہاں ہی کتابیں کھوال کر پڑھتا تھا اور اس طرح کوئی ایک ڈیڑھ مہینے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلتے پھرتے، گھومتے میں یہاں آ پہنچا۔

میں دن کو مزدوری کرتا تھا اور مزدوری کے ان پیسوں سے روٹیاں لا کر کبھی دودھ میں اور کبھی پانی میں بھگو کر اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ جس روز کوئی کام نہیں ملتا تھا

اس روز یوں ہی رات کاٹتا تھا۔ دن بھر میں کسی کام میں ہوتا یا بیکار پھرتا۔ لیکن شام ہوتے ہی کسی سرائے یا مسجد کا رخ کرتا تھا جہاں پر سونے یا آرام کرنے کے بجائے میں اسٹیڈی کیا کرتا تھا کئی کئی دن بھوکا رہنے یا سخت کام کرنے کے باعث جب میں کافی کمزور اور لاغر ہوا تو میں مزدوری کے بجائے نوکری کی تلاش میں نکل پڑا۔ یہاں تک کہ مجھے ایک ہوٹل میں مشلچی کی نوکری مل گئی۔

یہاں مجھے بہت سویرے نیند سے اٹھ کر رات کو کافی دیر تک کھڑے کھڑے برتن، پیالے، پلیٹ، چمچے اور کانٹے وغیرہ صاف کرنے پڑتے تھے۔ اس سخت کام کے باوجود میں اپنے حال میں مطمئن تھا لیکن صرف دکھ اس وقت کا تھا جو مجھے یہاں اسٹیڈی کے لئے ملتا نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ اس وقت کے لئے میں نوکری کو ہی خیر باد کہد یتا لیکن مجھے روپے پیسے کی سخت ضرورت تھی ۔ کیونکہ ایک تو میری سبھی کاپیاں لکھ لکھ کر ختم ہو چکی تھی دوسرا مجھے دونئی کتابوں کی بھی ضرورت تھی۔ ان کاپیوں اور کتابوں کیلئے میں نے یہاں پورے دو مہینے نوکری کی میں ماہانہ پندرہ روپے پر یہاں نوکر ہوا تھا۔ لیکن دو مہینے کام کرنے کے بعد جب مجھے ٹوٹے ہوئے پلیٹ، پیلے اور کھوئے ہوئے چمچوں اور کانٹوں کی قیمت کاٹ کر صرف دس روپے دئے گئے تو میں یہ دس روپے لیکر یہاں سے بھاگ نکلا۔ ان میں سے میں نے پانچ روپے کے قریب کتابوں کاپیوں پر صرف کئے اور باقی پانچ روپے جیب میں رکھکر سرائے میں رہنے لگا۔ اتنا کہکر وہ خاموش ہوا اور وقفہ بھر بعد تیور بدل کر بولا۔

دن کو میں سرائے کے چوکیدار کے پاس کتابیں رکھ چھوڑتا تھا اور دن بھر کام

کاج کے بعد شام کے چوکیدار کے پاس کتابیں لیکر دیر تک پڑھتا رہتا۔اس طرح سرائے میں گزر بسر کرتا تھا۔اگر چہ سرائے میں زیادہ دنوں ٹھہرانے کی اجازت نہیں تھی لیکن چوکیدار مجھ پر کچھ مہربان ہوا تھا۔

ایک روز میں اپنی اسٹیڈی میں پورے طور منہمک تھا کہ سرائے کی لائن کی لائٹ آف ہوگئی اور میں اسٹیڈی جاری رکھنے کیلئے یہاں سے نکل کر دور ایک بجلی کھمبے کے پاس جس پر میونسپلٹی کا لمپ لگا تھا۔اسٹیڈی کرنے بیٹھ گیا۔

اس روز میں صبح سے مکمل بھوکا تھا سردی سے بھی ٹھٹھر رہا تھا بھوک اور سردی نے جب مل کر مجھ پر حملہ کیا۔تو میں بے سدھ ہونے کے بعد بیہوش بھی ہوگیا اور جس وقت میں اپنے ہوش و حواس میں آ گیا اس وقت پیدہ سحر نمودار ہو رہی تھی۔پورے طور جب میں نے ہوش میں آ کر ساری کتابیں غائب دیکھیں تو مجھے ایسا محسوس ہوا گیا یا سارا آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر میرے سر پر گر رہا تھا اور پیروں تلے زمین دریا کی طغیانی کی طرح تیزی سے بھاگ رہی تھی۔

غم کی اس شدت میں سردی اور بھوک نے ملکر مجھ پر یلغار کیا کہ میرے دل ڈوبنے لگا۔کلیجہ مسوسنے لگا، سر چکرانے لگا، بدن تھرتھرانے لگا اور میں دوبارہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔لیکن اس قت زیادہ دیر میں غشی میں نہیں رہا۔میں متوحشی کی کیفیت میں اپنی قسمت کو جس کو اب میں ماننے سے ہی قاصر ہوں پر زار و قطار رونے لگا۔

میں سر بہ گرمیاں ہو کر رو رہا تھا پورے بدن سے تھرتھراتا تھا بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا کہ کسی نے میرے دوش پر ہاتھ رکھکر پوچھا ''بچہ! تم روتا کیوں ہے''؟

میں نے سر اٹھا کر دیکھا ایک عورت میرے سامنے کھڑی تھی یکا یک میرے منہ سے ایک رونے کی چیخ نکل گئی اور اس نے میرے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھکر مجھے کھڑا کیا اور کہا۔ ''تم روتا کیوں ہے بیٹا''؟

اسکی آواز میں مجھے ماں کا پیار دکھائی دیا۔ میں بے اختیاری میں آگے بڑھا اور اسکی گود میں آ کر گریہ زاری سے رونے لگا۔ میں رو رہا تھا وہ مجھے سہلا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے اپنی گود میں اٹھا کر گلوگیر آواز میں پوچھا ''تمہیں کیا ہوا؟ تم کیوں رو رہے ہو؟''

''میں نے کہا۔ کیوں نہ روؤں، کوئی میرا مستقبل مجھ سے چھین لے گیا ہے۔'' اس نے میری اس بات پر خاص کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور بولی تم کہاں کے ہو؟ تمہارے ساتھ اور کوئی نہیں ہے''۔

''میں اسی دھرتی کا ہوں اور میرے ساتھ دکھ، مصیبت اور پریشانی ہے۔ وہ میری یہ فلسفیانہ باتیں اور وہ بھی س کم عمری میں سن کر حیران ہوئی اور میری طرف تو قیرانہ نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

''تمہارے ماں باپ نہیں ہیں کیا؟''

''یہ زمین میری ماں ہے اور وہ آسمان میرا باپ ہے اور ان کے درمیان میں لٹکا اور بھٹکا ہوں!''۔

''تم کیا اکیلے ہو؟'

اس نے پوچھا میں نے جواب دیا۔ ''نہیں میں اکیلا نہیں ہوں حالات میرے ساتھ ہیں۔ ''تم اتنے چھوٹے ہو کر ایسی بڑی باتیں کہتے ہو؟'' اتنا کہکر اس نے

مجھے ایک ماں کی طرح اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا اور اسی سینے کے ساتھ لگاتے اس نے مجھے وہاں لیا جہاں وہ اکیلی رہتی تھی۔ مگر جہاں اس سے ملنے رات دن کئی لوگ آتے جاتے تھے۔ اتنا کہکر پرنسپل ساگر خاموش ہوا اور طویل لمحے بعد بولا۔

''میری زبان سے تمام حالات سن کر اور میری ذہانت دیکھ کر اس نے ایک اولاد کی طرح میری پال پوس کی اچھے اچھے قیمتی کپڑے پہننے کو دئے اچھی اور طاقتی چیزیں کھانے کو دیں اور میرے پڑھنے کے شوق کو دیکھ کر مجھے انگریزی مشن اسکول میں داخل کروایا۔ اس طرح اپنے حال پر مطمئن رہ کر میں ماضی کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اسکے کرتوت دیکھ کر مجھے یہاں کوئی چین نہیں ملتا تھا اس پر جب مجھے چھوٹے اور بڑے رنڈی کا بیٹا، حرام کا بچہ نامی طعنے دینے لگے تو میں نے اس ٹھکانے کو بھی خیر باد کہہ دیا اور پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ مارا مارا پھرتا رہا۔

میں مارا مارا پھر رہا تھا اور وہ مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ ایک روز اس نے مجھے پکڑ کر اپنی مسرت کا اظہار کیا مگر میں اسے دھتکار کر اسے ہاتھ سے نکل گیا اتنا کہہ کر پرنسپل خاموش ہوا اور پیاس بجھا کر بولا۔'' اس روز شام کے قریب ایک شخص نے مجھے اپنے گھر لے لیا جہاں وہ مجھے اولاد کی طرح پالنے لگا وہ کافی مالدار شخص تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ صرف ایک بیٹی تھی جو اپنے شوہر کے ساتھ اپنے باپ کے ہاں مقیم تھی۔

انہوں نے مجھے دوبارہ مشن اسکول میں دسویں جماعت میں داخل کروایا کیونکہ نویں جماعت کا امتحان میں یہاں ہی پاس کر چکا تھا۔ انہوں نے مجھے گھر پر پڑھانے کے لئے ایک ٹیوٹر بھی رکھا۔

وہ میری دیکھ بھال بھی بڑی اچھی طرح کررہے تھے میرے لئے اپنی

ضروریات زندگی فراہم کرتے تھے۔اب میں اپنے حال میں خوش تھا۔اپنی چاہت کی تکمیل پر مطمئن تھا یہاں تک کہ میں نے میٹرک اور میٹرک کے بعد ایف اے، بھی پاس کیا۔

بی اے میں داخل ہوتے مجھے ڈھائی مہینے ہوئے تھے کہ میرا پدر ثانی بیمار ہوا۔ جب اسے جینے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تو اس نے میرے سامنے انکشاف کیا کہ اب میں نہ جانے کتنے دنوں کا مہمان ہوں۔تم بھی اب بالغ ہو چکے ہولہذا اب تم اپنا بندوبست کرو۔

میں اسکی باتوں پر حیران ہوااور پھر انکساری سے بولا۔

''میرے مہربان باپ! آپ نے مجھے اس قابل بنادیا ہے۔میں اتنا ذلیل نہیں ہوں جو آپ کو اس کا صلہ نہ دوں۔اگر آپ اس میں راضی ہیں تو میں اپنی تعلیم بس کر کے اب ملازمت کروں گا۔اور آپ کا ہاتھ بٹا کر آپ کی خدمت کروں گا۔انہوں نے فرمایا بیٹا! تم ٹھیک کہہ رہے ہومگر میرے بجائے تمہیں اسکی خدمت کرنی چاہیے جس نے تمہیں اس قابل بنادیا ہے۔تمہیں یاد ہوگا جب تم چھوٹے تھے۔تنہا اور مایوس تھے تو تیرے سر پر کسی عورت نے شفقت کا ہاتھ رکھ دیا تھا۔اس نے تمہیں سینے کے ساتھ لگا کر انسان بنانا چاہا لیکن طعنے و تشنے بیچ میں حائل ہو گئے اور تم نے اپنے آپ کو اس محبت و شفقت سے محروم کیا لیکن اسکے ہوتے ہوئے بھی اس نے تمہیں اس شفقت اور پیار سے محروم نہیں ہونے دیا کیونکہ اس نے تمہیں میرے سپرد اسی روز کیا جس روز تم نے اس کو سر بازار بے عزت کر کے دھتکارا تھا۔

''وہ ہر مہینے مجھے نہ صرف تمہاری پال پوس اور اخراجات کی رقم دیتی تھی بلکہ وہ مجھے آپ کی پڑھائی کا معاوضہ بھی دیتی تھی۔ وہ بھی نہیں چاہتی تھی لوگ تمہیں رنڈی کا بیٹا یا حرام کا بچہ کہہ کر پکاریں''۔

یہ سب سن کر میں بے آب وتاب ہو کر یہاں سے نکل کر اپنی مدرثانی کے پاس آیا اور اس کے قدموں پر گر پڑا۔

اس نے مجھے اولاد کی طرح اپنے سینے کے ساتھ لگایا اور میں نے اسی وقت سے اپنے آپ کو اس کی خدمت کے لئے وقف کیا اب وہ جوانی سے ڈھل رہی تھی۔ پیشہ بہت کرم کراتی تھی میں اس کے دئے ہوئے ایک مکان میں گذر بسر کر رہا تھا اور اپنی تعلیم جاری رکھ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں ڈبل ایم اے کے بعد بی ٹی میں شامل ہو گیا۔

''اچھا اسکے بعد کیا ہوا؟'' پروفیسر بھان نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔
بی ٹی میں شامل ہونے کے بعد وہ میری شادی کرانے لگی۔ لیکن میں نے انکار کیا کہ جب تک میں فارغ التحصیل نہ ہو جاؤں میں شادی نہیں کروں گا ویسے شادی کرنے کے بجائے میں اب باقی عمر تمہاری خدمت میں بسر کرنا چاہتا ہوں۔''

اسکے بعد میں نے اسے پیشہ چھوڑنے کا ایما کیا۔ کیونکہ اس قسم کی باتیں میں اسکے سامنے براہ راست کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی وہ میرے ہوتے ہوئے کبھی کسی کو اندر داخل ہونے دیتی تھی۔

اسکے بعد میں جتنا اسکے قریب رہنے لگا تھا۔ تنا ہی وہ مجھے اپنے ہاں بار بار آنے پر منع کرتی تھی محض اسلیئے کہ لوگ میری ذات کو نگاہ غلط سے نہ دیکھیں جو

میری زندگی میں کسی قسم کی روکاوٹ کا پیش خیمہ بن جاتے۔

اپنے علیحدہ مکان میں وہ میرے لئے ضروریات زندگی کے ساتھ عیش وعشرت کا سامان مہیا کراتی تھی۔ایک حقیقی ماں کی طرح اس کی ایک تمنا تھی میں اچھی تعلیم پڑھ کر بڑا آدمی بن جاؤں اسلئے نہیں کہ بڑا آدمی بن کر میں اس کا معاوضہ چکا سکوں بلکہ وہ مجھے بڑے آدمی کے روپ میں اسلئے دیکھنا چاہتی تھی تا کہ میں اپنے ماضی کو بھول کر اپنے مستقبل کی اس خوشی کو پاسکوں جو مجھ سے اس وقت کھو چکی تھی جب اس نے پہلی بار میرے دوش پر شفقت کا ہاتھ رکھد یا تھا۔

لوگوں کی نظروں میں وہ ایک جو بڑی عورت تھی۔لیکن جب میں اسکے پاس ملاقات کے لئے جاتا تھا۔تو وہ مجھے ہر وقت برائی سے بچنے کی نصیحت کرتی تھی اس کی باتیں اس کا اٹھنا بیٹھنا،کھانا پینا،اس کا سلیقہ اور خلوص دیکھ کر میں اس کا قائل ہو جاتا تھا وہ نرم دل،انصاف پسند اور ملنسار کے ساتھ کافی سمجھدار اور ذہین بھی تھی لیکن جو برائی اس میں تھی وہ یہی تھی کہ وہ پیشہ کراتی تھی۔

اور بحثیت ایک پیسہ ور عورت کے نہ وہ دین کی تھی نہ دھرم کی نہ خدا کی تھی نہ خدا کے اصولوں کی رہ چکی تھی۔وہ اپنے پیغمبر کی امت میں شامل نہیں تھی۔نہ ہی اولیاؤں کی پیروی کرنے والی جماعت میں داخل ہونے کے قابل تھی۔وہ نبی ﷺ کے نام پر قربان ہونا فخر سمجھتی تھی وہ اولیاؤں اور فقیروں کا نام بڑی عقیدیت سے لیتی تھی اسے مذہب کی خاص کوئی واقفیت نہیں تھی لیکن وہ خدا اور مذہب کو پتھر کی لکیر کی طرح مانتی تھی مگر میں ان سب باتوں کے خلاف تھا ہمارے درمیان یہی ایک تضاد تھا۔وہ مجھے خدا دکھانے کے بجائے ان کی حقیقت سے اس

طرح قائل کرتی تھی گویا جنت و جہنم یہی کمرہ ہوتا تھا جس میں ہم ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ مجھے دوسروں کی طرح کمیونسٹ، ملحد، بے دین اور لامذہب نہیں کہتی تھی البتہ ان سب باتوں کو جو وہ کسی سے میرے بارے میں سن چکی تھی ماننے کے لئے منت زاری کرتی تھی تا کہ میں اصلی راہ سے بھٹک کر خدا کے عتاب کے بعد جہنم کی نذر نہ ہو جاؤں۔

''اچھا پھر کیا ہوا؟'' پروفیسر نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اسی طرح چلتے بڑھتے بی ٹی سے فارغ ہونے کے بعد میں ایم پی کالج میں پہلے لیکچرار بنا پھر پروفیسر کے عہدے پر تعینات ہوا یہ سروس کرتے ہوئے مجھے کئی دن ہی ہوئے تھے کہ مجھے ماں کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ جب میں اسکے پاس پہنچ گیا تو دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ صرف بارہ گھنٹے بیمار رہتے ہوئے اسکے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی۔ میں بے تاب ہو کر اسکے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے بستر ہ سے بازو نکال کر میرا ہاتھ پکڑا۔ میں ڈاکٹر لے آنے کے لئے جانے لگا تھا مگر اس نے جانے سے روک دیا۔ کیونکہ ابھی ابھی ڈاکٹر اُسے دیکھ کر گیا تھا۔

میں نے اسکی حالت کے بارے میں اس سے دریافت کیا تو وہ ایک طویل وقفے کے بعد کچھ اس انداز سے بولی گویا وہ مجھے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی اس نے کہا۔

''دیکھو بیٹا! دراصل ہر شخص مرد یا عورت مرنے کے لئے بیمار نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات ہوتی تو بھلے چنگے آدمی نہیں مرتے یہ تو مانی ہوتی بات ہے کہ مرنے کا ایک دن مقرر ہے لیکن اس دن سے ہر ایک بے خبر ہے۔ اگر آج میں بیمار نہیں بلکہ بھلی چنگی ہوتی تو بھی مجھے تم سے یہ ضرور کہنا چاہیے تھا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو'' میں نے بے صبری سے پوچھا، وہ ذرا تامل کر کے بولی۔ ''میں کوئی راز کی بات بتانا نہیں چاہتی ہوں تم کو شائد اس بات کا تجربہ ہوگا کہ ہر مذہب پرست چاہے وہ عورت ہو یا مرد بڑے اقرار کر لیتے ہیں میں گنہگار ہوں۔ اور جب کبھی میں یہی الفاظ اپنے بارے میں کہنا چاہتی ہوں تو مجھے شرم آتی ہے!''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور اپنے چہرے سے خفت مٹا کر بولی۔

''خیر ان باتوں کو چھوڑ دو، دراصل میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تمہارے سوا میرا اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ اگر چہ میں نے کسی بچہ کا جنم نہیں دیا ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں جب کوئی ماں بچہ جنتی ہے تو اسے اس کے ساتھ یہ چاہت یہ غرض ضرور وابستہ ہوتی ہے۔ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو یہ ہمارا ہاتھ بٹائے گا۔ ہماری خدمت کرے گا۔ اور ہمارے مرنے کے بعد ہمارے لئے مغفرت کی دعائیں مانگا کرے گا۔ اگر چہ میں نے تجھے جنم نہیں دیا ہے۔ پھر بھی مجھے ایسا لگتا ہے گویا تم میری چھاتی کا رس چوس کر، میری گود میں پل کر اتنے بڑے ہوئے ہو لیکن، زندگی میں میرا ہاتھ بٹانے یا میری مدد کرنے کے لئے میں نے تمہیں اولاد نہیں جانا بلکہ میرے دل میں تمہاری ایسی کوئی ہمدردی پیدا ہوئی جس نے یہ کام کیا ورنہ میں کسی قابل نہ تھی۔ خیر سے اب میری زندگی کے دن بیت گئے۔ اسلئے تم بھی میرا ہاتھ بٹانے میری تابعداری کرنے کے غرض سے سبکدوش ہو گئے۔ مگر آخرت کے فرض''۔ اسکی پوری بات حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ماں! تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ صاف صاف بتاؤ!''

اس نے کہا۔ ''میں جس فرض کو بجا لانے کی درخواست تم سے کرنا چاہتی

ہوں تم ان باتوں کو مانتے نہیں۔''

میں اس کا مدعا بھانپ گیا اور کچھ سوچ کر بولا۔''دیکھو ماں ! میرے عقیدے جو بھی ہوں لیکن تمہارے لئے میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔

''تو کیا تم خدا سے میرے لئے میرے مرنے کے بعد مغفرت کی دعائیں مانگا کروگے؟''س نے قدرے حیران ہو کر پوچھا اور پھر تیور بدل کر بولی۔

''دیکھو بیٹا میں گنہگار ہوں۔اگر باری تعالےٰ نے میرے گناہ نہیں بخش دئے تو میں!''

''نہیں! تم جہنم میں نہیں جاسکتی اب اگر جاؤ گی تو میں جا کر تمہارے خدا سے تمہارے لئے مغفرت کی دعائیں مانگا کروں گا اور مسجد سے نکل کر تمہاری قبر پر یہ بوچھنے آیا کروں گا۔مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا جارہا ہے تاکہ اسکے لئے میں مزید کچھ کاروائی کروں''۔

''اچھا تو جامع مسجد جا کر آپ خدا کے حضور میں کیا کہتے ہیں؟'' پروفیسر بھان نے پوچھا۔

''میں''! اس نے پہلو بدل کر کہا۔''میں وہاں جا کر نہایت ہی ادب سے بیٹھ کر پہلے اس ماں کو یاد کرتا ہوں اور پھر ہاتھ دراز کر کے من ہی من میں کہتا ہوں۔اے خدا اگر تیرا کوئی وجود ہے اگر جنت و جہنم دو قائم مرکز ضرور ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ آپ اپنے بندوں سے حساب و کتاب لینے کے بعد انہیں اسکی سزا و جزا دیتے ہیں تو میں آپ سے یہ التماس کرتا ہوں کہ آپ میری مدد ثانی کے تمام گناہ معاف کر اور ان گناہوں کی جو بھی سزا ہو وہ آپ مجھے عطا کر اور اسکے

بدلے میں اسے وہی مرکز عطا کرے جسے ہم نے جنت کا نام دیا ہے“۔

”اچھا تو یہ بات ہے“؟ پروفیسر نے پوچھا۔

”ہاں بات تو یہی ہے۔ مگر آپ کو یہ نہیں کہنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں کیونکہ ایک تو آپ کو بھگوان پر کوئی شک کوئی ابسواس نہیں۔ دوسرا آپ کو یہ نہیں کہنا ہے کہ اسکے گناہ آپ مجھے عطا کر بلکہ آپ کو یہ کہنا ہے اس کے گناہ آپ ساگر پنچابی کی کتاب میں درج کر کے اس کی مدرثانی کو جنت نصیب کر کیونکہ وہ اسی کے مستحق ہے۔“

”اچھا تو قبرستان جا کر مجھے کیا کہنا ہے؟“ پروفیسر نے پوچھا۔

”آپ کو اس قبر پر کھڑے ہو کر کہنا ہے دیوی! میں تیرے بیٹے کی خاطر تمہارے پاس یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تمہارے جنت کے لئے ہمیں یہاں اور کچھ تو نہیں کرنا ہے اور اسکے بعد آپ کو اسکے لئے مغفرت کی دعائیں مانگنی ہیں۔ جس طرح کہ آپ مانگا کرتے ہیں۔ ویسے ہو سکا تو کل میں آپ کا سہارا لے کر خود ہی یہ آخری فرض ادا کروں گا۔ اگر میں ایسا کر سکا تو اگلے سال آپ اپنی بیٹی کے جنم دن پر میری ماں کی موت کا دن بھی منانا اور یہ سارا کام انجام دینا“۔

جامع مسجد سے نکل کر جب پروفیسر بھان اپنی منزل کی طرف چلدیا تو یکا یک اسے پرنسپل ساگر کی یاد آئی۔

قبرستان پہنچ کر جب وہ ایک مشہور طوائف کی قبر کے سامنے کھڑا ہوا تو دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے سے پہلے اس نے اپنے آگے پیچھے اپنے اردگرد نگاہیں دوڑائیں۔ قبرستان کے اس گہرے سنائے میں اسے مرحبا اور شاباش کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے آواز پہچان لی اور پھر اس انداز سے ان سب قبروں کو دیکھنے

لگا۔ گویا اس سارے قبرستان میں صرف ماں اور بیٹے کی شخصیت زندہ تھی۔

وہ کھڑے کھڑے ایک نظر سے اس ماں اور دوسری نظر اسکے بیٹے کو دیکھ کر ان کی انسانیت کو یاد کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ وہ منظر یاد کر رہا تھا جب ساگر پنجابی کی وصیت کے مطابق اسے اس طوائف کے پہلو میں دفنایا تو گیا مگر جس کو لوگوں نے ملحد، بے دین اور لامذہب جان کر بغیر کسی تجہیز و تکفین کے یہاں پر لاکر رکھدیا تھا۔

پروفیسر کو اس کی ماں کے ساتھ یہی شخصیت اس وقت یہاں زندہ دکھائی دے رہی تھی جہاں مردے دفن ہیں۔

دعائیں مانگ کر جب پروفیسر قبرستان سے لوٹنے لگا تو اسکے ملنے اپنے کالج کا لکچرار سردار جسونت سنگھ کھڑا ہوا اور وہ رازدارانہ انداز میں اس کی طرف بولا۔

"معاف کرنا" میں نے آپ کو جامع مسجد میں گھس کر نکلنے اور پھر یہاں تک آکر اس طوائف کی قبر پر جھکنے کی سب حرکتیں دیکھ لی ہیں کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں یہ سب کیا ہے"۔

پرفیسر بھان بھیگی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سردار جسونت سنگھ کو کچھ کہنا چاہتا مگر کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس نے رومال سے آنسو پونچھ لئے اور پھر اسے اپنے ساتھ لے کر سردار جی کو ساری داستان سے واقف کیا۔

پروفیسر کی زبانی کا اصلی ماجرا سننے کے بعد سردار جسونت سنگھ ایکدم رک گیا اور پروفیسر کو اس انداز سے گھور گھور کر دیکھنے لگا گویا وہ اسے کہہ رہا تھا۔

"پروفیسر بھان! تمہاری موت کے بعد میں اس فرض کے لئے جامع مسجد سے نکل کر وہاں جایا کروں گا جہاں انسان دفن ہے"۔

⌘⌘⌘

دسہرہ کی سیتا

چرخے کی روں روں میں جب نرملا کو کھنکار کی آواز آئی تو اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ لیکن دوسرے لمحے وہ ایکدم کھڑی ہوئی۔ چرخے کو اُٹھا کر طاق میں رکھ دیا اور آگے بڑھ کر...... دروازہ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

ناتھ جی کے کھنکار کی آواز پہچان کر جب اس نے ناتھ جی کو ہی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا تو لمحہ بھر کے لئے اسے اپنی یاداور پہچان پر رشک سا ہوا۔ اس نے ناتھ جی کو نمستے کہا اور ناتھ جی نے بھی ہاتھ جوڑ کر نمستے کا جواب دیا اور پھر کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ نرملا تیز مگر دبے پاؤں رسوئی میں آئی اور بیٹی شیلا کو قہوہ بنانے کے لئے کہہ گئی۔

"کون......کون آیا ہے......؟" شیلا نے چولھے میں لکڑی گھسیڑتے ہوئے پوچھا، چولھے کی طرح اس وقت اس کے بدن سے چنگاریاں سی اُٹھ رہی تھیں۔ دل میں ایک نامعلوم خلش سی پیدا ہو رہی تھی۔ ذہن میں ایک تذبذب سا ہو رہا تھا۔ کثیف دھوئیں کے مرغولے اس کے بدن سے ٹکرا کر اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کو اپنے ساتھ کھڑکی کے راستے سے خلاء کی طرف لے جا رہے تھے۔ اس نے دست پناہ ہاتھ سے چھوڑ کر پہلے آنکھوں کو ملا پھر والہانہ آواز میں ماتا

جی کی طرف کن آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔

''وہ......وہ آیا ہے؟''

''ہاں......! آیا......''تم قہوہ بناؤ''

شیلا سماوار لے آنے آگے بڑھی اور نرملا......اس نے حقے میں پانی بھر دیا 'ناتھ جی حقے کی مئے منہ میں رکھ کر اس انداز سے تمبا کو کو دھوئیں میں منتقل کر رہا تھا گویا کہ وہ کسی گہری سوچ میں اپنے آپ سے بھی بے خبر بیٹھا ہو، ویسے جس طرح نرملا ناتھ جی سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی، اسی طرح ناتھ جی بھی نرملا سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر حقے کی گُر......گُر......رَر......گُررَر کے سوا کوئی سکوت کو نہیں توڑ رہا تھا۔ آخر چلم بھر تمبا کو کو راکھ کرنے کے بعد ناتھ جی نے حقے کے نے ہاتھ سے چھوڑنے کے ساتھ ہلکی سی آواز میں گویا اپنے آپ سے کہا......''ماسٹر جی کب آرہے ہیں؟''

''وہ......وہ......!''مارے شرم کے نرملا کی آواز کانپنے لگی۔لیکن جلدی میں اپنے چہرے سے سرزنش کے آثار زائل کرتے ہوئے بولی۔

''دو چار دنوں کے بعد تو آئیں گے اب......''

ویسے!''ماسٹر جی اب یہاں سے تبدیل ہونے کی کوشش میں ہیں......''

''اچھ......چھا!''ناتھ جی نے بے صبری سے پوچھا اس کی بے صبری سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا گویا کہ ماسٹر جی کی تبدیلی اسے ناگوار گزری ہے

''لیکن وہ اتنی جلدی یہاں سے جا کیوں رہے ہیں؟''

نرملا اس کا اسے کوئی جواب نہ دے سکی حالانکہ جواب اس کے پاس موجود

تھا۔لیکن کہنے سے اس طرح کتراتی کیونکہ نرملا جانتی تھی ناتھ جی ماسٹر کا ذکر کیوں کرر ہے ہیں ۔اتنے میں شیلا قہوہ کس سماوار لیکر آئی اور ماں کے سامنے رکھکر واپس چلدی۔

''شسی ......شیلا کو یہ کیا ہو گیا ہے......؟ بیمار تو نہیں تھی؟!

ناتھ جی نے اس کے جاتے ہی کلفت آمیز لہجے میں پوچھا،نرملا کے منہ سے ایک دلدوز آہ نکلی اور متاسفانہ انداز میں بولی۔''اس کے پیٹ میں ایک دو دن سے درد رہتا ہے۔نہ جانے کیا بات ہے......؟ ویسے اس جگ میں شریفوں کو بدنامی سے بڑھ کر کوئی روگ نہیں،کوئی بیماری نہیں......ناتھ جی!''

''بالکل ٹھیک بتایا تم نے......''

'بدنامی ہی تو سیتا کی موت کا باعث بنی جس نے رام چندر جی کو بھی زد میں لے لیا لیکن بدگوئی کرنے والے بدنامی کرنے والے اڑوس پڑوس میں موجود رہتے ہیں ۔لیکن تم فکر نہ کرو بھگوان کی کرپا سے تمہیں وہ گھر دلاؤں گا......وہ گھر دلاؤں گا کہ جس پر ساری بستی رشک کرے گی......آخر ناتھ جی کی عمر یونہی تو نہیں گذری۔''اتنا کہہ کر اس نے قہوہ کا کٹورا آستین پر رکھا اور خاموشی سے پھونکتے پھونکتے پینے لگا۔

''بھگوان کے بعد ہمیں تیری ہی آشا ہے'' نرملا نے اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے سکوت توڑا اور تھوڑا دیر کے توقف کے بعد کہا۔

''ایشور کی کرپا اور تمہاری مہربانی سے ہی میں شیلا پتری کے ہاتھ پیلے کروں گی۔''

''ہاں تو......میں بھی اسی فکر میں گاؤں گاؤں کی خاک چھانتا ہوں،گھر گھر

منجھا پہنچا تا ہوں......، کیا کریں گے نہ جانے اس جنم میں کیا بھوگ رہے ہیں۔ سچ پوچھو تو انصاف اور ہمدردی کا آج کل نام ہی نام رہ گیا ہے......، بھگوان دانا و بینا ہے وہ ہمارے کرموں کو دیکھ رہا ہے...... کیوں ٹھیک ہے نا؟!......

''ہاں ناتھ جی! اپنے ہی کرموں کا بھوگ رہے ہیں'' نرملا کربناک لہجے میں کہہ کر خاموش ہوگئی۔ پھر خود ہی خاموشی توڑ کر بولی......'' وہ......، آپ نے کہا تھا۔ اس کا کیا ہوا پھر؟

''بھگوان سب کچھ ٹھیک کرے گا'' اس نے قہوہ کا گھونٹ نگل کر جواب دیا......'' آج پھر وہاں جاؤں گا......، ویسے یہ کوئی ایسی بات نہ تھی لیکن یہ گاؤں والے جہاں کہیں بھی میری طرف سے بات پکی کرنے کی خبر سنتے ہیں تو وہاں جا کر من گھڑت باتیں سنا سنا کر میرے کئے دھرے پر پانی پھیر دیتے ہیں......شرم بھی نہیں آتی ان کو، آخر تو سبھی پتر پتری والے ہیں۔ میں بھی ان سے کچھ کم نہیں ہوں۔ ناتھ جی نے بھی تو اسی بستی میں جنم لیا ہے، میں ان کی باری آنے پر ان کی راہوں پر ایسے روڑے اٹکاؤں گا۔ حرام تخم یاد کریں گے......''

''آج آپ وہاں کس سمے جائیں گے''؟ نرملا وقفہ بھر بعد رنجیدہ و کبیدہ خاطر ہو کر بولی......ناتھ جی نے کہا

''میں تو وہیں جا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر خیال آیا، چلو نرملا بہن کی خبر لیتے جائیں''

بھگوان آپ کو سدا خوش رکھے......آپ ہمارا خیال نہ رکھیں تو کون رکھے گا'' اس نے مضمحل انداز میں کہا۔ ناتھ جی تھوڑی دیر تک خاموش رہا اور کچھ سوچ

کر بولا...... ''تمہارا...... میرا مطلب ہے۔ آفتاب کول زندہ ہوتے تو وہ شیلا جیسی اکلوتی بیٹی کی شادی اُزک تزک سے کرتے...... خیر وہ بھی تو ایشور کی ہی مرضی تھی۔''

ہاں ایشور کی ہی مرضی تھی، نرملا گلوگیر آواز میں بولی اور................ ناتھ جی نے کٹوری رکھدی چلم اتار کر اس میں تمبا کو بھرتے ہوئے بولا۔ ''آفتاب کول کہا کرتے تھے۔ میری اکیلی پتیری ہے اس کی شادی پر میں تجھے بہت بہت خوش کروں گا...... یہ میری ہی بدقسمتی تھی کہ وہ بے چارہ نہ رہا، ویسے تم بھی تو میری محنت کی خوب قدر کرتی ہو۔ جھوٹ کیوں بولوں، آخر بھگوان کے سامنے حاضر ہونا ہے۔''

ناتھ جی کی زبان سے یہ سنتے ہی نرملا سماوار اٹھا کر چلدی اور وہاں سے ترک بھر چاول لا کر ناتھ جی کو دیتے ہوئے بولی۔

''سری کنٹھ سے کہا تھا شالی مشین پر لیجاؤ اسے فرصت نہ ملی جب ہم شالی کوٹ کر لے آئیں گے تو اور دیں گے۔ فی االحال یہ لیجئے۔''

''کو...... کوئی بات نہیں۔ مجبور کیوں ہو رہی ہو، اپنا ہی گھر ہے۔'' اس نے چادر کندھے پر سے اتار کر اس میں چاول لیتے ہوئے کہا اور پھر رخصت ہوا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے نرملا اس کے ساتھ ساتھ آئی اور جب برآمدے میں پہنچ کر دونوں ٹھہر گئے تو نرملا معصومیت سے بولی ''اب آپ وہیں جائینگے نا۔''

''ہاں وہیں جاؤں گا، پہلے یہ چاول گھر چھوڑ آؤں گا...... اور زندہ کول سے بھی ملوں گا۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا، اور خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلدیا۔

ناتھ جی زیادہ تر جوڑے ملانے کے بجائے جوڑوں میں رخنے ڈال کر اور پھر ان میں ملاپ کرانے کے ساتھ ازدواجی زندگی میں پڑے رخنوں کو رفع کرانے کے لئے اپنی چاپلوسی اور علم سفینہ کی لسانی سے لے کر جنتر منتر سے کام لیتا اور رفو گر کی طرح پیوند دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح طرفین سے طے شدہ نذرانہ لیتا ہے۔ اگرچہ شیلا کا معاملہ ایسا نہ تھا لیکن بعض وجوہ کے بنا پر اس سے بڑھ چڑھ کر ہی تھا اور اسی لئے شیلا کی ماں نرملا، چچا زندہ کول اور ماما سری کنٹھ کا یہی خیال تھا۔ اس معاملے میں ایشور کے بعد یہی مختار ہیں اور ان کے بغیر کار برآوری ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ یہ چاہیے تو گھڑی کے چھٹے انش میں چٹکی بجائے شیلا کا گھر بسوا سکتا ہے۔ مگر ناتھ جی کے خیال میں اگر ایسا ہوا تو بلا ناغہ دعوتیں کیسی ہوں۔ فصلانے کہاں سے آئیں، اور ان جیسی آسامی کہاں پھنس جائے اور زندہ کول جیسے سودر سے قرض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ بدنامی رفع کرانے اور پھر شیلا کے ہاتھ پیلے کرانے کا نذرانہ کہاں سے ملے۔ سچ تو یہ ہے کہ آفتاب کول کے سرگباش ہونے کے بعد جب آمدنی کا مسئلہ پیش آیا تو نرملا نے مکان کا ایک حصہ کرایہ پر لگادیا۔ شہر سے تبدیل ہو کر ماسٹر جی کو میشور آ کر نرملا کے گھر میں بس کیا گئے۔ شیلا کے ساتھ ان کے تعلقات کا چرچا ہوا ایسے چرچا پھیلانے میں ناتھ جی کا بھی ہاتھ رہا۔

جس طرح زندہ کول کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی اسی طرح آفتاب کول کے مرجانے کے بعد اس کے گھر میں بدنامی کی کچھ کسر نہ تھی۔ دیہاتی توضع کی

جبلت، اس پر ناتھ جی دلال کی غرض مندی سونے پر سہاگہ تھی، کھلانا پلانا، لینا دینا، جب اوروں سے بڑھ چڑھ کر ہونے لگا تو شیلا کے سہاگ کے بارے میں جو جو مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ ان کی من گھڑت تفاصیل سنا سنا کر اور ان مشکلات کو رفع کرانے میں اپنی دلالی کی قوت سے لے کر جنتر منتر تک کی ساری کارستانیاں جتا کر......اچھے بڑے گھرانوں کے سبز باغ دکھا کر خوب اچھی طرح نذرانہ کس لیتا۔

کرمیشور میں جو دو ہزار کے قریب نفوس کی آبادی پر مشتمل گاؤں ہے اور جس میں پنڈت، سکھ، مسلمان سبھی شامل ہیں۔ چھوٹی بڑی پانچ دکانیں ہیں مگر زندہ کول کی دکان شہرت میں یکتا ہی ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس میں اور دکانوں سے زیادہ مال زیادہ سودا ابھرا پڑا ہے، بلکہ زندہ کول کی شیریں گفتاری، حاضر جوابی، ملنساری نے قریب قریب گاؤں بھر کے سب کسانوں کی موہ ہی لیا ہے۔ بڑوں کے ساتھ بڑا، چھوٹوں کے ساتھ چھوٹا اور عورتوں کے ساتھ عورت بن جانے کی اور کوئی اس سے سیکھے۔ ٹھٹھ مخول اور دل لگی میں تو گاؤں بھر میں اس کا کوئی ثانی نہیں، جس کی وجہ سے وہ سودے کے ساتھ باتیں اور باتوں کے ساتھ سودا بھی فروخت کرتا ہے اور خوب کماتا ہے۔ زندہ کول جتنا دکان دار کی حیثیت سے مشہور ہے اس سے زیادہ سودر کے نام سے زبان زد عام ہے۔ بستی کے مرد عورتوں کا خیال ہے اس کے پاس لاکھوں روپے جمع ہیں اور ہزاروں روپے بستی کے کسانوں کے پاس ہیں۔ گاؤں بھر میں شاذ ہی کوئی ہوگا جو اس کا مقروض نہ ہو۔

شیلا کی بدنامی اس پر اس کی شادی کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد ناتھ

جی نے زندہ کول کو باتوں باتوں میں غیرت دلائی۔ آفتاب کول کے مرنے کے بعد شیلا کے باپ کے فرائض اپنے سر لینے کا ادعا اور یہ سب کر کے شیلا کی شادی کا بارگراں اُٹھانے کے لئے التجا...... اصرار اور نہ جانے کیا کیا حربہ استعمال کیا اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا زندہ کول جیسے سود در اور مکھی چوس سے یہ کہلوایا کہ تم کسی جگہ بات پکی کرو، اس میں جتنا خرچہ آئے گا وہ سب میں دیدوں گا۔

اس وقت جبکہ وہ گھر میں چاول چھوڑ کر زندہ کول کی دکان پر آیا تو نمستے کا جواب دینے سے پہلے ہی زندہ کول ایسا گھبرایا جیسے کہ نمستے کے ساتھ اس نے اُسے تصدیع دے دی۔

ناتھ جی نبض پر ہاتھ رکھکر بولے سُنا ہے ماسٹر جی یہاں سے تبدیل ہو رہے ہیں؟"

قریب تھا کہ زندہ کول اسے کوئی جواب دے دیتا ماسٹر جی کا نام سن کر ان کا پارہ چڑھ گیا البتہ لہجہ بدل کر بولا۔ "شیلا بیٹی کی بات تم نے کہاں پہنچادی؟"

"بس وہیں جواب لینے جا رہا ہوں۔ جاتے جاتے خیال آیا آپ کی خیر خبر لیتے جاؤں اور کچھ خرچہ بھی"!

زندہ کول مطلب سمجھ گیا۔ ایک روپیہ نکال کر ناتھ جی کے ہاتھ میں تھما دیا

شام کب کی ہو چکی تھی نرملا بیٹی شیلا کے پیٹ پر گرم گرم تیل کی مالش کر رہی تھی لیکن شیلا...... اسے افاقے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ چند دنوں سے اس کی پیٹ میں جو درد پرورش پا رہا تھا، اگرچہ آج صبح سے اس کا زیادہ اثر نمایاں تھا۔ لیکن شام ہوتے ہی اس نے جو دھاوا بول دیا اس سے نہ صرف اس کی ماں نرملا بلکہ

ماموں سری کنٹھ اور ماسٹر جی بھی گھبرا گئے۔ جو کل ہی شہر سے واپس آ گئے تھے۔

ادھر یہ سب اس درد کے افاقے کی تدبیریں کر رہے تھے۔ اور شیلا ......وہ درد کی شدت سے اب زمین چاٹنے لگی تھی رفتہ جب اس نے صدائے کرب اور واویلا سے ماتا جی کے ساتھ ماما جان اور ماسٹر جی کو پریشان کیا تو اس زد میں ان کے اڑوسی پڑوسی سب ہی آ گئے۔

شدت غم سے نرملا پائمال ہو رہی تھی اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اسے اچانک یہ کیا ہو گیا......شیلا پتری کی کربناک آوازیں اس کے دل وجگر پر برچھی بنکر اتر رہی تھی۔ اس پر شک وشبہ اسے بری طرح تڑپا رہا تھا......ایک طرف سری کنٹھ شیلا کو سہلا رہا تھا، دوسری جانب ماسٹر جی نرملا کو صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا اور تیسری جانب بھی حالات کا اندازہ کر کے گھبرا رہے تھے۔

رات گئے تک جب شیلا کے اضطراب میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تو سپید صحر نمودار ہوتے ہی ماسٹر جی نے انہیں مشورہ دیا کہ شیلا کو اب شہر لے جانا چاہیے، مشورہ معقول تھا اس لئے کہ اس اذیت ناک درد میں شیلا کی زندگی اور موت کا سوال تھا مگر ایک دیوار جیسی رکاوٹ بھی تھی اور وہ رکاوٹ مزید...... بدنامی کا خدشہ تھا۔ ویسے کسی بھی طور پر انہیں شیلا کو شہر لے جانیکے سوا کوئی چارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور وہ بھی ماسٹر جی کے ہمراہ

صبح کے وقت شیلا کے اضطراب میں تھوڑا بہت فرق ضرور آیا، لیکن ایسا فرق تو نہیں جو انہیں کسی طرح خاموش رہنے کی ترغیب دیتا، آخر کچھ دیر تک مسلسل

اصرار کے بعد ماسٹر جی نے انہیں شیلا کی زندگی اور موت کا تصور دلا کر اس بات پر

راضی کرلیا کہ اسے شہر لے کر یا تو ہسپتال پہنچائیں گے یا کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔

شیلا کے ساتھ اس کی ماں، اس کا ماما اور ماسٹر جی جب شہر کی طرف روانہ ہوتے تو شیلا کے چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا۔ جیسا کہ وہ مہینوں کی بیمار تھی۔

وہ اس وقت آہستہ آہستہ ماتا جی کے دوش کا سہارا لئے اس انداز سے جا رہی تھی گویا وہ اپنے بدنام قدم اس زمین پر رکھنا نہیں چاہتی تھی جس زمین پر اس کی یہ جوانی پروان چڑھ رہی تھی۔

اس وقت اس کے جسم اور جسم کے انگ انگ میں کپکپاہٹ تھی چہرے پر اُداسی، ماتھے پر افسردگی، چال میں حسرت تھی اور......ان دنوں اس کی عمر اٹھارہ سال سے متجاوز تھی۔ اس کے بنگالنوں کے سے ڈھیر کے ڈھیر لمبے لمبے سیاہ بال کمر سے نیچے تک لٹکے ہوئے تھے۔ کل پرسوں تک جو چہرہ کالی گھٹا میں چمکیلا چاند سا لگ رہا تھا اس وقت ڈوبتا سورج دکھائی دے رہا تھا، اس کی وہ بڑی بڑی سیاہ موہنی آنکھیں جن پر ہرن کی آنکھوں کا شائبہ ہوتا تھا۔ ان کے گرداب سیاہ حلقے پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ آج سے صرف چند دنوں پہلے نرگسی آنکھوں کی بھوئیں......اُف! بھوئیں تھیں کہ کمانیں جیسے کسی چابک دست نقاش نے سیاہ پنسل سے سپید قرطاس پر بنائی تھیں۔ بلند ستوان، ناک، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، جن پر مسکراہٹ سے ایک دلفریب چمک پیدا ہوتی تھی نہ جانے آج وہ چمک کہاں چھپی پڑی تھی۔

رُخساروں پر دوشیزگی کے سرخ خون کی جھلک سے شبہہ ہوتا تھا۔ شائد

روز لگایا ہے۔ لیکن...... آج تو ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسا کہ اس نے امبری سیب کو شرمانے والے رخساروں پر ہلدی لگا دی ہے۔

وہ بیضوی چہرہ، چھوٹا سا دہانہ، خوبصورت بتیسی، جن کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہنا، جی چاہتا تھا۔ آج مایوسی برسا رہی تھی۔ گداز سینہ اور سینے کے اُبھار...... کمر کی نزاکت اور جسم کے نچلے حصے کے ابھارہ کا ایک مخروطی شکل میں کم ہوتا جانا اور ان سب حصوں کا باہمی توازن و تناسب فطرت کی نادرہ کاری کا ایک ایسا نمونہ تھا جو بار بار دیکھنے میں نہیں آسکتا۔ آج اضطراب کی صورت بنا کر دیکھنے والوں کو حسرت کی آہ بھرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔

چلتے بڑھتے لڑکھڑاتے جب وہ لاری اڈہ میں پہنچ کر گاڑی میں سوار ہوئی تو مڑ کر اس نے اپنے گاؤں کی طرف حسرت بھری نگاہ دوڑائی اور پھر نظریں اپنے دامن پر گاڑ دیں۔

چوپالوں میں شام کی ''اکٹھ'' میں صبح کو پنگھٹ پر ڈول چھوڑنے اور رسی کھینچنے کی موسیقی میں، ندی میں پانی کے گڈھے ڈبوتے ہوئے اور میدانوں میں مویشی چراتے، گوبر جمع کرتے اور اسے سکھائے ہوئے جوان لڑکیوں، ادھیڑ عمر کی اور بوڑھی عورتوں کی زبان پر شیلا کی کارگذاریوں کے تذکرے پہلے سے ہی تھے لیکن اس کے ہسپتال جانے کے بعد گاؤں بھر میں ہراس سا پھیل گیا۔ ماسٹر جی کے یہاں ڈیرہ جمانے کے وقت ہی سے ان دونوں پر شک کی نظریں گاڑی جا رہی تھیں۔ جیسا کہ ماسٹر جی عصمت و آبرو کے دریا میں غوطہ لگانے کے لئے ہی شہر سے آکر نرملا کے گھر میں بود و باش کر رہا تھا اور آج...... ماسٹر جی کے ساتھ شیلا

بھی بدنامی کے عمیق دریا میں غوطہ زن تھی۔

شیلا کا یہ ہرگز خیال نہ تھا وہ ایک مرغی...... کنواری مرغی ہے...... جو انڈا دینے کے لئے اپنے گاؤں سے ماسٹر جی کے شہر جا رہی ہے

اُسے گاؤں بھر کی لڑکیوں، عورتوں، جوان مردوں اور بوڑھوں کے زبان زد تذکروں کا پورا پورا احساس تھا۔ اس لئے گاؤں بھر میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ ماسٹر جی کا نرملا کے گھر میں ڈیرہ جمانا بے معنی نہیں اور اس قیاس آرائی میں لوگ نرملا سے بھی کچھ اجنبیت اختیار کرنے لگے تھے۔

نرملا کی بیٹی گاؤں بھر میں حُسن اور خوبصورتی کے لئے مشہور تھی۔ اس کی خوبصورتی اور موزونیت میں مقناطیسی کشش بھی تھی۔ اس لئے چھیڑ چھاڑ کے ساتھ وہ لوگوں کی چہ میگوئیاں کی بھی شکار ہوتی تھی، چہ میگوئیوں کے علاوہ بعض الٹہر نوجوان راہ چلتے اس پر ایک دو فرقے چست کر ہی دیتے تھے اور کچھ دوست ہمسائے رسمی فرض میں لپٹ کر خلوص کے میتھے تیر پھینکنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔

اس موقت جو چند ایک لڑکیاں اور کئی عورتیں تالاب پر پانی کے گھڑے بھر رہی تھیں۔ اسی تذکرے میں منہمک تھیں اور آپس میں کہہ رہی تھیں۔

"میں نے کہا وہ...... درد زہ سے رات بھر چلا رہی تھی......" نرملا کی ایک پڑوسن بولی۔

"آں...... ہاں! دوسری عورت نے جواب دیا......" اس کا اُبھرا ہوا پیٹ درد اور کرب کی اذیت ناک لہروں پر جیسے ڈول رہا تھا...... بیلد کبھی کرنے نہ دی اُس نے......"

ایک جوان لڑکی بولی۔"میں نے سوچا تھا وہاں جاؤں۔لیکن پھر خیال آیا اس وقت یہ اندر کیسے آنے دیں گے۔میری طرف دیکھتے ہی ان کی مٹی پلید ہو جائے گی۔"

"میں نے سنا ہے وہ بُری طرح چیخ رہی تھی اور......، اور منہ سے زمین چاٹ رہی تھی" ایک نوعمر لڑکی نے استفہامیہ انداز میں جو کہا تو ایک بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

"تم ابھی اس درد کو کیا جانو، جب تیری شادی ہو گی...... جب ایک بچہ جنے گی۔تب پتہ چلے گا...... ہاں!"

"مگر یہ بات کیا ہے؟" ایک تجربہ کار عورت بولی......" ماسٹر جی کو یہاں آتے ہوئے تو ابھی صرف پانچ مہینے ہوئے۔"

"تم کیا جونا......" جواب میں آواز آئی......" اس کے پاس ابھی تم بچی ہو...... سمجھی......"۔

"میں نے سُنا ہے۔اس وقت بھی ماں اور بیٹی ماسٹر جی کے پاس بیٹھی تھیں۔ایک پنڈتانی بولی......" شرم بھی نہیں آتی ان کو اس پر بھی ماسٹر جی کے ساتھ شہر گئے ہیں......(خ تھو!)

ایک دوشیزہ طنزیہ انداز میں بولی......"

"ماسٹر جی کے ساتھ شہر نہ جاتے تو کہاں جاتے۔"

"میں نے سنا ہے وہ ہسپتال گئی ہے...... حمل گرانے!"...... دوسری طرف سے آواز آئی۔

"اب اس کے بغیر چارہ بھی کیا ہے...... اپنے کئے دھرے کا خمیازہ تو بھگتنا

ہے۔اسے۔"

"کتنی بے حیالڑکی ہے۔نہ شرم نہ غیرت، نہ اپنے گھربار، نہ خاندان کی عزت کا خیال ......اُف توبہ"!ایک چنچل لڑکی نے گھورتے ہوئے کہا۔

"جب اپنوں نے کچھ نہیں کہا تو ہم کہنے والی کون ہیں۔جس کا جو جی میں آئے کرے......اب کچھ لوگ کہتے یہں ،ہم یہاں ایسا نہیں ہونے دیں گے"۔ جو ایسا کہتے ہیں وہ اپنے گھر کی خبر تو لیں......کیوں ٹھیک نہیں کہہ رہی ہوں میں۔"

"ہاں ٹھیک ہے"۔ایک ادھیڑ عمر عورت بولی"پر کیا نہیں ہونے دیں گے وہ یہاں......جو ہونا تھا سو ہوا......بدنامی تو ہوگئی اس گاؤں کی۔"

"ہمارے پیر تلے کی خاک کی بدنامی ہوگئی......"

ایک دوشیزہ پلکیں مٹکاتے ہوئے بولی......" ہم کاہے کو بدنام ہو جائیں......"

"ہاں......ہاں! جو ایسا کرے گا وہ ہی بدنام ہوجائے گا......"

قریب قریب سبھوں نے اس کی تائید میں کہا۔اور پھر سب کی سب پانی سے بھرے گڑھے اٹھا کر ایک کارواں کیصورت میں اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوگئیں۔

زندہ کول کی دکان پر اس وقت چھوٹے بڑے اور بوڑھے اسی طرح جمع ہو رہے تھے جس طرح لوگ عموماً کچہری میں جمع ہوتے ہیں۔دیکھتے ہی دیکھتے یہاں ایک پنچایت سی لگ گئی۔بالعموم ایسی بیٹھکوں اور دیہاتوں کی کاشتکارانہ

تجارت کا تعلق ہوتا ہے۔ جس میں موسم کے حالات پر تبصرے اجناس کے بھاؤ، گھریلو خبروں کا تبادلہ، ذاتی معاملات کے تصنع، پنچایتی تنازعے جنگل کے راکھی کی ہٹ دھرمی، پٹواری کے فصلانوں، نذر آنوں کی ادائیگیاں، قرض کا لین دین، چوپالوں کے فصل کو نقصان پہنچانے کی جوکھم جوکھا۔

اس کے علاوہ گھریلو تنازعے، میاں بیوی کے روٹھ جانے کے اسباب، خانگی جنگوں، دانتا کلکل کے واقعات اور شادی بیاہ وغیرہ کے معاملات...... یہ سب زندہ کول کی دکان پر روزانہ کا عمل درآمد تھا۔ اگرچہ اس پیٹھ میں نہ کوئی کمپیٹیشن ہوتا ہے نہ معاصرانہ ربط اور نہ ہی اقتصادی جوڑ توڑ، پھر بھی پینٹھ روزانہ لگی رہتی ہے۔ مگر آج...... آج تو اس پینٹھ کا نیا ہی موضوع مرکز گفتگو تھا۔

کسی نے بات کے ساتھ چلم میں تنا کو بھرا تو دوسرے نے اس کے ہاتھ سے چلم لے کر اس میں آگ رکھدی۔ اسی طرح کسی نے نسوار کی ڈبیہ کھولی اور کسی نے نسوار کی چھوٹی بوتل کھول کر اس میں سے نسوار نکالی اور چٹکی میں لے کر دانتوں میں اس طرح ملا، جس طرح کہ دانتوں ملا جاتا ہے۔ کسی نے نسوار کو ناک کے قریب لا کر سونگھا تو چھی...... چھین...... چھ چھیں نے اپنا دھاوا بول دیا۔

"میں نے کہا وہ آیا ہے...... ماسٹر جی!" ایک بوڑھے کسان نے نسوار کی تھوک تھوک کر کرخت لہجے میں کہا...... ایک صوفی منش کسان نے فوراً جواب دیا۔

"اب کیوں نہ آتا۔ کنواری مرغی نے گھر میں جو انڈا دیا ہوگا۔"

تیسرا کسان جس کے چہرے پر مہندی رنگی داڑھی تھی اس پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے بولا۔

''یہ تو ہماری ہی بے غیرتی ہے۔ جس نے ماسٹر جی کو ایسا کرنے کا موقع دیا''

''تو...... تمہارا خیال ہے۔ ماسٹر جی کو یہاں سے نکالنے کا؟!'' ایک لمبے تلک پنڈت نے ماتھے پر شکن لاتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں......؟!'' ایک غصیلی آواز آئی۔

''ایسے شخص کو ہم یہاں ہرگز نہیں رہنے دیں گے۔''

''اس کو ہم ٹکڑے ٹکڑے کر کے شہر بھیجدیں گے۔''

''وہ بھی کیا یاد کرے گا۔'' ایک نوجوان اشتعال آمیز لہجے میں بولا

''ایک بات کہوں......؟'' دوسرے پنڈت نے کہا ''اصل میں ماسٹر جی کا اتنا قصور نہیں بلکہ اُن کا ہے جنہوں نے اسے اپنے ہاں ڈیرہ جمانے دیا۔ اگر ڈیرہ جمانے ہی دینا تھا تو کوئی علیحدہ مکان یا کمرہ دیا جاتا اسی طرح نہ یہ بدنامی ہوتی نہ ہی یہ نوبت پہنچتی جب کہ آج...... آج وہ......

''حمل گرانے گئی ہے''۔ دوسرے نے اس کی بات پوری کردی۔

زندہ کول اگر چہ یہ باتیں بغور نہیں تو بھی ضرور سُن رہا تھا۔ خجالت اور ندامت سے اس کے چہرے پر جو سیاہی اور زردی پھیل رہی تھی۔ وہ اس کی اندرونی کیفیت کو بخوبی آشکارا کر رہی تھی۔ نفرت اور انتقام کے لئے اس کا دل و دماغ بھڑک رہا تھا۔ اس کے ضمیر اور اس کی روح کو اس وقت کافی اذیت پہنچ رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا......

اس وقت اسے وہ صرف ماسٹر جی سے سخت نفرت ہو رہی تھی بلکہ ان گاؤں

والوں پر بھی غصہ آرہا تھا جو اس کے سامنے اس کے خاندان کی تحقیر کرنے کی جرأت کر رہے تھے۔

اتنے میں اسکول سے زندہ کول کا چھوٹا بیٹا آیا اور آتے ہی ان سے بولا...... ماسٹر جی روئی میں کچھ لپیٹ کر لائے ہیں۔ وہ دوسرے ماسٹر جی کو دکھا کر کہہ رہا تھا۔ یہ شیلا کے پیٹ سے ہسپتال میں نکالا گیا ہے۔"

ایسا سنتے ہی سب کے سب ایک دوسرے کی طرف غصیلی نظروں سے اس طرح دیکھنے لگے جیسے وہ ماسٹر جی نہیں بلکہ ان کی بستی میں راوَن آیا تھا جس نے سیتا کو مقید کر رکھا تھا اور اب اپنے غرور و طاقت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شدت غم، افسوس اور حجالت سے ندہ کول کاٹ کھاتی نظروں سے دیکھ کر اس طرح دانت پیس رہا تھا کہ اگر کہیں اس وقت اسے ماسٹر جی کی پرچھائی بھی دکھائی دیتی تو وہ اس پر جانور کی طرح جھپٹ کر اسے دانتوں سے چبا جاتا۔ ایک طرف زندہ کول کی یہ حالت تھی، دوسری جانب ماسٹر جی کی یہ جرأت دیکھ کر کوئی غصہ سے شرابور ہوا کسی کے کان کی لوئیں گرم ہو گئیں، کسی کے چہرے پر اُداسی چھا گئی اور کسی کے ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں......اور یہ سب کچھ ہونا ہی تھا کہ سب پینٹھو والے زر خرید غلاموں کی طرح اپنے آقا کی خوشنودی کے لئے انتقام پر آمادہ ہو گئے۔

"دیکھ لیا نا، تم لوگوں نے ہماری شرافت کا کس طرح ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے......" ایک نوجوان فیصلہ کُن لہجہ میں بولا ہی تھا کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ہاں یہ ہماری شرافت کی سراسر توہین ہے۔"

"یہ تو سارے گاؤں کی توہین ہے

''ہم یہاں ایسا نہیں ہونے دیں گے''

''ہم ماسٹر کو زندہ دفنا دیں گے۔''

زندہ کول اپنی جگہ پر بیٹھا گردن جھکائے یہ سب کچھ سُن رہا تھا اور جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک جلوس ماسٹر جی کی ذات کے ساتھ سکول پر حملہ کرنے جا رہا تھا ان کے شور و شر سے اور لوگ بھی گھروں سے نکل آئے اور ان کے ساتھ چھوٹی بڑی لڑکیاں، جوان اور بوڑھی عورتیں بھی شامل ہو گئیں۔ رام کی سیتا راون کے لنکا پر حملہ کرنے جلدیئے

دیکھتے ہی دیکھتے جب انہوں نے اسکول پر ہلہ بول دیا۔ تو تین ماسٹروں کے ساتھ سکول کے سب لڑکے اس شور و غوغہ سے بہت گھبرائے اور معاملہ کو جاننے کے لئے دھڑ ادھڑ نیچے آئے، ان کا نیچے آنا ہی تھا کہ ایک گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ لاٹھیاں چلنے لگیں۔ پتھر پھینکے جانے لگے......اگرچہ حملہ صرف ماسٹر جی کی ذات پر تھا مگر وہ اس جمِ غفیر میں دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ اس وقت وہ کہاں تھا اور اس پر کیا گذر رہی تھی۔ اس سے سبھی بے خبر تھے۔

ماسٹر جی اور اس کی ماں بہن اور باپ دادا کے نام دشنام اور صلواتیں دے دے کر یہ لوگ یہ امتیاز ہی کھو بیٹھے جبکہ باپ بیٹے پر وار کر رہا تھا۔ بیٹا باپ کو دبوچ رہا تھا...... بھائی، بھائی، کا خون بہا رہا تھا۔

اگرچہ اسکول کے بچے ان کے اپنے اور آس پاس کے گاؤں کے اپنے بچے تھے مگر اس وقت چند لوگوں کے ساتھ ان کو بھی ماسٹر جی کی پارٹی یعنی راون کی سینا میں شامل جان کر ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کر رہے تھے۔

جب لڑائی گھمسان کی ہونے لگی تو ان وحشیوں نے اس بپھرے ہوئے جم غفیر کا فائدہ اٹھا کر یہاں جنگ کا بازار جیسا گرم کر دیا۔

ہم یہاں ایسا نہیں ہونے دیں گے...... کے نعروں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی ماں بہنوں اور بچوں کے ساتھ جو کچھ بھی کیا، کوئی دیکھنے کی تاب نہ لاتا تھا۔

جب صدائے واویلا شور و غوغا ساری بستی میں آگ کی طرح پھیل گیا تو جو جو، اب تک اپنی کھیتوں اور اپنے گھروں میں مصروف کار تھا وہ بھی اپنا کام کاج چھوڑ کر یہاں آیا اور اس گھناؤنے ماحول میں شریک ہو گیا۔

ماسٹر جی کو راون جان کر گاؤں بھر میں لنکا ڈھایا جا رہا ہے۔ سیتا کے اغوا کا بدلہ لیا جا رہا ہے۔ اور مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ شیلا کے پیٹ سے ہسپتال میں جو بچہ نکالا گیا اور جو روئی میں لپیٹ کر ماسٹر جی شہر سے لایا ہے۔ اسے پیش کیا جائے۔ فوری طور پر پنچ بلایا گیا۔

ماسٹر جی کو پنچ کے سامنے پیش ہونے کی چتاونی دی گئی۔

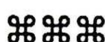
ماسٹر جی کو زندہ کول اپنے ساتھ پنچایت کے احاطے میں لایا انہوں نے اجتماع میں بتایا شیلا میری بیٹی کے سماں ہے۔ اور آپ جو سمجھ رہے ہیں وہ سب غلط اور بے بنیاد ہے۔ شیلا بیٹی پویتر ہے اس کا سرینگر کے ہسپتال میں ابارشن نہیں ہوا بلکہ اپریشن ہوا بلکہ ماسٹر جی نے روئی میں لپٹا ہوا گوشت کا لوتھڑا دکھایا اور بولا۔

شیلا بیٹی کے پیٹ سے اپنڈ ڈسائیٹس (انتڑیوں کا پرٹکڑا) نکالا گیا۔ اگر اسے فوری طور پر ہسپتال نہیں پہنچایا جاتا اور وہاں ان کا فوری اپریشن نہیں ہوتا تو وہ زندہ نہیں بچ سکتی، میرے ہاتھ میں یہ حرام کا بچہ نہیں ہے بلکہ میری منہ بولی بیٹی

کے انتڑی کا ٹکڑا ہے۔ جس پر آپ نے یہ ہنگامہ کیا اور اس گاؤں کو لنکا بنایا وہ آپ کی ذہنی پراگندگی کے سوا کچھ نہیں۔

اس پر سرپنچ اور پنچوں کے ساتھ گاؤں والوں کی گویا زبان بند ہوگئی۔

شیلا سب لوگوں کے سامنے "دسہرہ کی سیتا" بن گئی۔



دیوی دیوتا

نوجوان سے رخصت ہو کر جب وہ گھر آئی تو اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرتے ہی دھڑام سے گر گئی، اسلئے نہیں کہ آج وہ ایک غیر مرد سے مقابلہ آرائی کر کے آئی اور نہ ہی اسلئے کہ نوجوان نے اسکی توہین کی تھی بلکہ وہ اس لئے کہ آج اسکے خیالوں اور ارادوں کا اونچا مینار ڈھا گیا تھا۔ آج وہ اپنے آپ کو ایک جابر، ایک ظالم اور ایک پاپی جان رہی تھی۔ آج اسے اپنی دیانت اور شرافت اپنی ہی نظر میں ایک پاپ دکھاتی دے رہی تھی۔

آج وہ اپنی کمزوری کے پردے میں ظلم، اپنی نیکی کے پیچھے پاپ دیکھ کر بے چین ہو رہی تھی۔ اپنے نیک کردار پر اسے جتنا ناز تھا اتنا ہی آج وہ اپنے آپ کو ایسی بدترین عورتوں میں شامل دیکھ رہی تھی۔ جنہوں نے پاک دامن ہوتے ہوئے بھی اپنے وقار کی خاطر دوسروں کا مضحکہ اڑایا ہو، جنہوں نے شرافت کی پتلیاں بن کر اپنی مغرورانہ حرکتوں سے خاندانوں کو اجاڑ دیا ہو، آج اسے اپنے آپ سے سخت نفرت ہو رہی تھی۔ آج وہ اپنے آپ کو بری طرح ملامت کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔

"اگر میں قدم قدم پہ احتیاط برت رہی تھی اگر میں نرم دل تھی اور کسی پر ظلم

کرنا جانتی نہیں تھی تو......، پھر مجھ سے یہ سب کیوں کر سرزد ہوا اور اگر ہوا تو اس کی تلافی کیسے ہوگی؟ کیا اسکے لئے مجھے......؟ اسکے آگے وہ کچھ سوچ بھی نہ سکی۔

یکا یک اسکے خیالوں اور ارادوں کے وسیع سمندر میں ایک دھماکہ ہوا جس سے اس کا سر چکرا گیا۔ اسکے بدن کا انگ انگ تھر تھرا اٹھا اور وہ اس دھرتی کو گھومتے محسوس کرنے لگی۔

ایک غیر مستحکم خیال جو ظلم کی تلافی کے خیال سے پیدا ہوا تھا اس پر مزید سوچتے ہوئے وہ پامال سی ہو رہی تھی وہ اس خیال کو ہی نہیں بلکہ اسکے جنم کی راہوں کو بھی مٹانا چاہتی تھی۔ لیکن یہ خیال جو اپنے نقوش اسکے ذہن پر مرتسم کر گیا تھا۔ اسکی اکاسی کرتے ہوئے وہ اپنے سہنرے خواب ملیامیٹ ہوتے دیکھ رہی ہے وہ اپنی زندگی کو اس شاہراہ پر دیکھ رہی ہے جہاں حسرت وغم، پریشانی اور دکھ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔

''کیا ایک ذی حس دوشیزاہ ہو کر وہ اس دکھ پریشانی اور غم کو خود ہی گلے لگائے گی''۔؟ اس خیال سے اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ دماغ ماوف ہوا اور وہ نیم پاگل جیسی ہونے لگی وہ اس دکھ، غم اور پریشانی سے نکلنا اور کامیابی کی منزل پر کھڑا ہونا چاہتیہے لیکن اس طرح اسکے کئے ہوئے ظلم کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ حالانکہ وہ اس کی تلافی ضرور چاہتیہے۔

ایک جانب کامیابی کی منزل اسکے سامنے اپنا دامن پھیلا رہی تھی دوسری طرف ناکامی اس کو گھیر رہی تھی۔ اب وہ کیا کرے گی اور کیا نہیں کریگی اس کا اپنے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دماغ اس کا ایسا سوچنے سے پہلے ہی ماوف ہو رہا

ہے اور دل وہ مشورہ سننے سے پہلے ہی کچھ اس طرح دھک کر رہا ہے گویا وہ ہر ایک بات پر صرف انکار کر رہا ہو۔ وفعتاً وہ کھڑی ہوگئی اور وہاں سے چلدی نہ جانے کہاں اور کدھر؟۔

صفیہ وومنز کالج کی ان لڑکیوں میں ہرگز نہیں تھی جو فیشن کی دلدادہ ہیں یا جنہوں نے شرم وحیا کو ایک کھلونا سمجھ رکھا ہو، حالانہ حسن کی جاذبیت اور خوبصورتی میں وہ گنی چنی تھی۔ اس نے اپنا کردار کچھ ایسا بنا رکھا تھا کہ اس پر پرنسپل صاحبہ کو بھی ناز تھا۔ وہ بہت صاف گو تھی اور ان لڑکے لڑکیوں کی طرف دوبارہ دیکھنا گوارہ نہیں کرتی تھی جو ایک بار اسکی نظر میں گر جاتے تھے۔ آج تک اس نے شاید ہی کسی نوجوان کو بھرپور نظر سے دیکھا ہوگا یا کسی کو دیکھنے کا موقع دیا ہوگا۔ وہ برقعہ پہنتی نہیں تھی لیکن راستہ چلتے ہوئے اسکی حیا اور اس کی پاکی اس کا سب سے بڑا پردہ ہوتا۔

وہ کالج گیٹ سے نکلتے ہی سر کو جھکالتی تھی اور گھر کے صحن میں پہنچنے تک جھکائے رکھتی لیکن پچھلے ایک ہفتہ سے اس میں ایک نئی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ راستہ چلتی تو اب معلوم ہوتا کہ اس کی نگاہیں گویا کیس کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے جب وہ کالج کے گیٹ سے نکل کر بڑی سڑک پر آئی تھی تو اچانک اس کی نظر فٹ پاتھ پر کھڑے ایک نوجوان پر پڑی۔ شاید وہی ایک نوجوان تھا جس کو زندگی میں پہلی بار اس نے نہ صرف بھرپور نظر سے دیکھا تھا بلکہ اسے بار بار دیکھنے کی کوشش بھی کر چکی تھی۔ یہ نوجوان کون تھا اور وہ اسے کب سے جانتی ہے۔ اس سے پہلے

اس نے اسے کہا دیکھا تھا؟ اس کا اسے کچھ پتہ نہیں چلا وہ اسے ضرور بھول پاتی اگر کالج کے گیٹ سے نکلتے ہی اسکی نظر ہر روز اسی نوجوان پر نہ پڑتی۔ نظر کے ٹکرانے کے ساتھ ہی یکا یک اسکے بطون سے یہ سوالات ابھرنے لگتے۔

''یہ نوجوان کون ہے؟ اور میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔؟'' جب اسے اسکا کوئی جواب نہیں ملتا تو وہ راستہ چلتے ہوئے اپنی یاداشت کو کوسنے کے ساتھ اس کو بھلانے کی بھی کوشش کرتی تھی وہ اسے ضرور بھول جاتی اگر کالج کے گیٹ سے نکلتے ہی اسکی نظر پھر اسی نوجوان پر نہ پڑتی۔ اس نے کئی بار ارادہ کرلیا تھا کہ میں جا کر اس سے پوچھ لوں گی آپ کون ہیں؟ اور کیا آپ مجھے جانتے ہیں یا مجھے محض شبہہ ہے؟

لیکن وہ خود ہی نہ صرف ایسا کرنے سے احتراز کرتی تھی بلکہ اس خیال پر وہ اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگتی تھی۔ یہ سوالات پھر بھی اسکے ذہن پر جمے رہتے آخر اپنے آپ پر کافی جبر کرنے کے بعد جب وہ اس الجھن سے نجات پانے کے لئے نوجوان کو فٹ پاتھ پر کھڑا پا کر اس کی طرف بڑھنے لگی تھی تو نوجوان! وہ تو اس کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ نوجوان کے اس طرح بھاگ جانے کے بعد وہ اپنے آپ سے کہنے لگتی۔ ''اگر یہ نوجوان فٹ پاتھ پر میرے انتظار میں گھڑیاں کاٹ رہا ہے تو پھر یہ میرے پیچھے پیچھے اسی طرح کیوں نہیں ہو لیتا جس طرح عام طور پر دوسرے نوجوان حسین لڑکیوں کے پیچھے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ لیکن نہیں!!''

ایسا سوچنے کے بعد وہ گھبرا سی جاتی تھی۔ اور گھبرا کر جب وہ اسے پھر

بھلانے کا خیال کرتی تو اسے وہ پھر یاد آنے لگتا "میں نے اسے کہاں دیکھا ہے ؟ میں اسے کب سے جانتی ہوں؟ مجھے یاد کیوں نہیں آتا ہے؟ میری یاداشت کو یہ کیا ہو گیا ہے؟"

ایک روز اپنے کمرے میں بیٹھ کر وہ کتابوں کے مطالعے کے بجائے انہی پریشان کن سوالوں ی محو ومنہک تھی ۔ رفتہ رفتہ وہ یادوں کی دنیا میں کھو گئی اور اس نے یہ سوال حل کر لئے ۔

آج سے ڈھائی سال پہلے ہائی کلاس کا امتحان پاس کر کے جب میں نئی نئی کالج آئی تھی تو ہمارے ایک گروپ کو کشمیر کی سیر کو بھیجا گیا تھا ۔اس گروپ کے ساتھ میں بھی شامل تھی ۔ سرینگر کے قیام کے دوران ہم چند لڑکیاں شاپنگ کر رہی تھیں ۔ایک دکان سے نکل کر جب میں فٹ پاتھ پر چلنے لگی تھی تو ایک نوجوان مجھ سے ٹکرایا تھا ۔ وہ ٹرے لین کا قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا ۔اسکی آنکھوں پر گاگل لگی تھی ۔ مجھ سے ٹکرا کر وہ رک گیا تھا ۔ مجھے نوجوان کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا تھا اور دہلی سے باہر اپنے قومی وقار کو بلند رکھنے کے جذبے کے تحت میں نے ایک زور کی تھپڑ اس نوجوان کے چہرے پر رسید کی تھی ۔ میری اس تھپیڑ سے اس کا گاگل گرنے کے ساتھ اسکی بوکھلاہٹ دیکھنے کی تھی ۔

وہ ہکا بکا بھوت بنا کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا ۔ان دنوں مجھے انگریزی کی چند ایک گالیاں بھی یاد تھیں وہ میں نے اسے کہہ سنا دی تھیں ۔ یہاں تک کہ ہمارے ارد گرد ہجوم کھڑا ہو گیا تھا ۔

یوں تو عورت ایک فرو ذات مانی ہوئی ہے لیکن سر بازار جب وہ کسی مرد

کو کچھ جلی کٹی سنانے کے ساتھ ایک تھپڑ بھی لگا دیتی ہے تو اس وقت وہ ایک شیرنی بن جاتی ہے ۔ کیونکہ اس وقت اسے عام لوگوں کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے چاہے قصور اسی کا کیوں نہ ہو، اس وقت راہگیر بھی نسوانیت کے طرفدار بن جاتے ہیں، چنانچہ معاملہ دیکھے جانے بنا راہگیروں اسے اس قدر پیٹا کہ ایک طرح سے اس کا سر پھوڑا گیا اور اس جم گھٹے کا فائدہ اٹھا کر جب میں نے پیر سے سنڈل نکال کر اسکی مزید مرمت کرنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو میرا ہاتھ ایکدم رک گیا تھا۔ کیونکہ میری نظر اسکی آنکھوں پر پڑی تھی ۔ جن میں وہی آنسو ابھر رہے تھے جو عورت ذات کا حصہ ہیں اور جب ایک عورت انہی آنسوؤں کو ایک مرد کی آنکھوں میں دیکھتی ہے تو اس کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے اور اسکی قوت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ہتھیار ان آنسوؤں کے سامنے ڈال دیتی ہے۔ اس پر جب ماتھے سے خون بہ رہا ہو

چنانچہ میں نے سنڈل پھینک دی اور میں موم کی طرح پگھلنے لگی پھر اپنی حرکت کے جواز کے طور پر میں بے اختیار ہو کر بولی تھی۔ ''کمینے کہیں کے''!

ایسا نہ کہو!'' پلیز، مجھے گالی نہ دو! فٹ پاتھ پر کھڑا ایک شخص اسکی صفائی میں بولا۔

''میڈم! آپ غلط سمجھ رہی ہیں یہ نوجوان ایسا نہیں ہے یہ انجانے میں ہو گیا ہو گا ورنہ اپنی شرافت میں یہ فرشتہ ہے۔''

''فرشتہ!'' میں طنزیہ انداز سے بولی تھی''۔ آج کل کے چھوکرے اور......

''آپ مجھے فرشتہ نہ کہو، مگر شیطان بھی نہ جانو!'' نوجوان غمگین لہجے میں بولا تھا۔ لڑکی کو دھکا دینا میں اپنی توہین سمجھتا ہوں میں سچ کہہ رہا ہوں، میں نے تمہیں

دیکھانہیں۔''

''کیا تمہاری آنکھوں میں روشنی نہیں ہے جو تمہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا!'' میں اکڑتے ہوئے بولی تھی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو آبھرانے لگے تھے۔ اور وہ بھرائی آواز میں بولا تھا۔

''ہاں اس وقت میں آنکھوں سے اندھا زبان سے گونگا اور کانوں سے بہرا ہوں۔ آج میرا سب کچھ لٹ گیا ہے۔ آج میری دنیا اجڑ گئی ہے کیونکہ آج......! اتنا کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا تھا اور جم غفیر کو چیر کر بھاگ نکلا تھا۔ اس نوجوان کے چلے جانے کے بعد میں اپنی حرکت پر بہت پچھتائی تھی اور سرینگر کے قیام تک برابر یہی سوچ رہی تھی ''یہ نوجوان تو بڑا نادم ہوا اور عورتوں کی طرح رونے لگا۔ وہ کسی صدمہ کا اظہار کر رہا تھا۔ شاید انجانے میں مجھے ان کا دھکہ لگا مجھے اپنی حرکات پر ندامت ہوئی۔

یادوں کی دنیا سے نکل کر صفیہ نہ صرف اس روز بھی بہت بہت پچھتائی بلکہ اسکی آنکھوں میں وہی آنسو ابھر کر لرزنے لگے تھے جو اس نے نوجوان کی آنکھوں میں دیکھے تھے۔

ممکن تھا کہ یہ سب سوالات حل ہو جانے کے بعد صفیہ اس نوجوان کا خیال چھوڑ دیتی اسکے ذہن میں اور نئے خیالات جنم لینے لگے تھے۔ اب تو اسے بخوبی پتہ چلا تھا یہ نوجوان کون ہے اور میں اسے کہاں جانتی ہوں۔ مگر اب یہ سوال حل نہیں ہوتا تھا کہ اس روز جب وہ مجھ سے ٹکرایا تھا اسکی کون سی دنیا اجڑ گئی تھی اس کا کیا کچھ لٹ گیا تھا؟ جس نے اسے آنکھوں سے اندھا زبان سے گونگا اور کانوں سے بہرا کر دیا تھا۔

آج بھی کالج سے نکل کر اس نوجوان پر نظر پڑتے ہی وہ رک گئی اور اسکے بارے میں سوچنے لگی ۔ وہ سڑک پار کر کے جب اسکے سامنے ٹھہر گئی تو نوجوان نے اسکی طرف بھرپور نظر سے دیکھا اور اس طرح تیوریاں چڑھا کر دیکھنے لگا گویا اسے یہ توقع ہی نہیں تھی جس کا وہ روزانہ کالج کے گیٹ کے سامنے فٹ پاتھ پر انتظار کرتا ہے۔ کبھی وہ اس کو اتنی نزدیک سے دیکھے گا۔

اتنے میں نوجوان نے ایک روٹھے ہوئے عاشق کی طرح منہ پھیر لیا اور پھر اسی انداز سے وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ صفیہ نے اسے پکڑنا چاہا تھا لیکن اس کا ہاتھ اٹھنے اٹھتے رک گیا تھا۔ پھر بھی وہ بے اختیار رو کر بولی ۔

ٹھہر د کہاں جاؤں گے؟ وہ ٹھہر گیا لیکن اس ٹھہراؤ میں ایک اضطراب تھا اور اس اضطراب میں نوجوان کا وجود دفنا جیسا ہو رہا تھا۔

صفیہ نے ادھر ادھر دیکھ کر اسے منانے کے انداز میں کہا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

نوجوان نے جواب کے بجائے ایک بار اور بھرپور نظر سے اسکی طرف دیکھا اسکی آنکھوں میں آنسو بھر رہے تھے۔ صفیہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا نوجوان سے وہ اس قدر دلچسپی کیوں لیتی ہے اس نوجوان میں ایسی کون سی مقناطیسی کشش ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اب اگر میں اس کی طرف کھینچ آ رہی ہوں تو یہ مجھ سے بھاگنے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔ اور جب میں اسے پکڑ لیتی ہوں تو یہ رونے کیوں لگتا ہے۔

"میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔" صفیہ التجائی کیفیت میں بولی تھی نوجوان نے نظر غائر سے اسکی طرف دیکھا تھا صفیہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو پڑھ رہی تھی

۔گویا اس پر لکھا تھا ''میں جانتا ہوں تم مجھے کیا کہنا چاہتی ہو، دراصل میں تمہاری ،زبان سے کچھ سننا نہیں چاہتا اسلئے نہیں کہ مجھے تمہارا کوئی دکھ ہے۔نہیں! البتہ میں بہت دکھی ہوں میں اپنے یہ دکھ کسی کے سامنے واضح نہیں کرنا چاہتا ہوں ۔اور نہ ہی کر سکتا ہوں۔تمہارے وجود میں میری زندگی کا ایک اہم حادثہ موجود ہے''۔

نوجوان کے چہرے پر یہ سب کچھ پڑھ کر صفیہ مکدر سی ہوگئی اور پھر دونوں آپ آگے بڑھ کر تنہائی میں جا کر ٹھہر گئے اور پھر پاس پاس بیٹھ گئے۔

تنہائی میں کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے تھے ۔پھر صفیہ سکوت توڑ کر بولی۔''کیا آپ مجھے اس حرکت کے لئے معاف نہیں کرینگے؟''

اس نے سر کے اشارے سے کہا تھا ''نہیں!''

''آپ میرے ساتھ بات کیوں نہیں کرتے ہیں کیا میں تمہاری نظروں میں اتنی ذلیل ہوں؟'' نوجوان نے فوراً اپنا ہاتھ اسکے منہ پر اس انداز سے رکھ دیا تھا گویا کہ وہ اسے کہہ رہا تھا۔ میں ایسا سننے کے لئے تیار نہیں تم کو ذلیل کون کہہ رہا ہے''؟

''آپ میرے ساتھ بات کیوں نہیں کرتے ہیں؟'' اس کی آواز میں ایک التجا تھی ۔نوجوان اس التجا سے کسی قدر مسحور ہوا اور اشارے سے بولا تھا''۔اسکے لئے مجھے مجبور نہ کرو۔

''دیکھیئے اگر آپ میرے ساتھ بات نہیں کرینگے تو میں نراش ہو جاؤں گا''۔

نوجوان نے اسکی طرف بھرپور نظر سے دیکھا تھا اور اشاروں میں بھول تھا۔''تم نراش ہو جاؤ گی، پگلی تم تو دکھوں سے نراش میرا ماضی ہو تم مصیبت زدہ حال ہو تم ہی میرا مستقبل ہو!''

''اگر آپ میرے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتے ہیں تو کوئی پرواہ نہیں'' اس

نے متاسفانہ انداز میں کہا تھا۔ ''لیکن آپ یہ جان لیجئے مجھے اس کا صدمہ تا حیات رہے گا کیونکہ یہ میری سب سے بڑی توہین ہے''۔ اتنا کہکر وہ ناراض ہو کر اٹھ کھڑی ہوگئی اور پھر ناراض ہو کر چلدی تھی البتہ ایک فاصلہ طے کر کے وہ پھر واپس لوٹ آئی۔ نوجوان اس وقت کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے صفیہ کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا گویا اسے معلوم تھا وہ پھر لوٹ آئے گی۔

کچھ دیر بعد وہ کاغذ کے اس ورق کو تہہ کر کے کھڑا ہوا اور اسے صفیہ کے ہاتھ میں تھما کر وہاں سے چلدیا۔

''صفیہ......!

تم نے مجھے اپنا واسطہ دیا۔ میری منت زاری کی پھر بھی میں تمہارے ساتھ بات نہ کر سکا۔ اس وقت میرے دل پر کیا گذر رہی ہے یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ صفیہ! سبھی جانتے ہیں کہ یہ دنیا دھرتی کسی کی میراث نہیں لیکن ایسا کہنے والے ہی اس دھرتی کے مضبوط ستون ہیں ان سب ستونوں میں سب سے مضبوط ستون صرف ماں کی ممتا ہے۔ جب یہی ماں کی ممتا ہمیشہ کیلئے کسی کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو اسکی دینا ہی اجڑ جاتی ہے۔ اس کا سب کچھ لٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ آنکھوں سے اندھا زبان سے گونگا اور کانوں سے بہرا ہو جاتا ہے۔ اور جب تک وہ واقعات پر قابو پالیتا ہے تب تک وہ دھرتی کے دیگر ستونوں سے ضرورت ٹکراتا ہے اور جس روز جس وقت میں تم سے ٹکرایا تھا اس وقت میری دھرتی کا مضبوط ستون گر چکا تھا۔ مجھے ماں کی رحلت پانے کی اطلاع مل چکی تھی اور میں جلدی جلدی گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ تمہارے ساتھ ٹکرایا تم نے مجھے سر

بازار رسوا کیا، میری غیرت میری عزت اور میرا وقار تم نے صرف ایک تھپڑ اور چند گالیوں سے ملیا میٹ کر دیا باقی کام راہگیراوں نے کیا! میری دنیا اجڑ گئی تھی اور دنیا والے صرف تمہارے روپ میں مجھ پر تازیانے لگا رہے تھے۔ جب گھر آیا صحن میں ماں کا جنازہ دیکھا مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے اپنا سر دیوار سے ٹکرایا اور بے ہوش ہو کر گر گیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو لوگ اس وقت میری ماں کو دفنا کر آخری رسوم ادا کر چکے تھے۔ ماں کی جدائی اور سر بازار رسوائی مار کے شدید احساس نے میرے اندر سے حوصلہ، ہمت اور جرات اسی طرح چھین لیا جس طرح سیاہی چوس سیاہی کو لیتا ہے دیوار کے ساتھ سر ٹکرانے سے میں زبان سے گونگا ہو چکا ہوں اور آنکھوں کی بینائی بھی کافی متاثر ہوئی ہے میں تمہارے ساتھ بات نہیں کر سکتا تمہارے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ میں تم سے ایک التجا کر رہا ہوں۔ کہ تم کبھی مجھے بات کرنے کیلئے مجبور نہ کرنا، کیونکہ اس وقت جو کچھ مجھے محسوس ہو رہا ہے اس کو میں بیان بھی نہیں کر سکتا۔ میں گونگا ہوں بات نہیں کر سکتا صرف اپنے زخموں کو ہر دم تازہ کر سکتا ہوں اپنے مستقبل کے لئے ضرور رو سکتا ہوں۔

تم مجھے اپنے آپ کی طرف دیکھ کر رونے دو، کیونکہ تمہارے وجود میں میرا دکھ اور صدمہ چھپا ہوا ہے۔

خدا حافظ

سلیم

کاغذ کے اس ورق پر سے نگاہیں ہٹا کر وہ اس طرح اپنے ارد گرد دیکھنے لگی گویا یہ زمین گھوم رہی تھی اور خود وہ بے ہوش ہو کر گر رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ

پر قابو پالیا تھا مگر یہاں ٹھہرنے کی تاب نہ لا کر آگے بڑھی۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی مگر اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ اس کا دل تڑپ رہا تھا اسلئے ہوش وحواس پرواز کر رہے تھے وہ گرتے گرتے سنبھل تو رہی تھی مگر یہ کہاں جانتی تھی گھر پہنچکر جب میں اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کروں گی تو دھڑام سے گر جاؤں گی اور پھر اپنے آپ کو ایک ظالم کا درجہ دے کر اسکی تلافی کے لئے مچلونگی۔ صفیہ نے یہ طے کرلیا ایک نوجوان کو گونگا بنانے میں اس کا ہاتھ ہے۔ وہ خود کو اس کا ذمہ دار مان کر اب اس کی تلافی پر آمادہ ہے۔

چوک کے دوراہے پر اس وقت وہ کاغذ کے پھول بیچ رہا تھا جب صفیہ کی نظر اس پر پڑی وہ قفہ بھر کے لئے رک گئی اور سوچنے لگی۔ "کیا یہ خود رنگین کاغذ کے پھول بنا سکتا ہے؟ کیا یہ یہاں اسی کی آمدنی پر گذارہ کرتا ہے؟ کاغذ کے پھول بیچتے ہوئے یہ گاہکوں کے ساتھ بات چیت کیسے کر سکتا ہے جب کہ یہ گونگا ہے۔ اتنا کچھ سوچ کر وہ آپ ہی آپ آگے بڑھنے لگی۔ وہ اس انداز سے قدم اٹھا رہی ہے گویا وہ کافی سوچ سمجھ کر ایک ایک قدم اٹھانا چاہتی ہے لیکن یہ قدم حالات اور واقعات پر غور کئے بغیر کوئی بھی مشورہ سنے بغیر کوئی بھی فیصلہ کئے بغیر آپ ہی آپ آہستہ ہی سہی اس منزل کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ جہاں سلیم کھڑا ہے۔ کیا یہ ٹانگیں انجام سے باخبر ہیں؟ اگر ہیں تو یہ بجلی کے کھمبے کی طرح بغیر کسی حرکت کے ساکن کیوں نہیں ہو جاتی ہیں۔

جب وہ نوجوان کے قریب پہنچ گئی تو کاغذ کے پھول ہوا کے جھونکے سے

ایسے ہلنے لگے گویا یہ پھول اسے کہہ رہے تھے ۔تم ادھر کہاں آرہی ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں یہ کاغذ کا پھول ہے ۔اس میں حسن ضرور ہے لیکن خوشبو نہیں وہ یکا یک رک گئی اور اس انداز سے اپنے آپ کا جایزہ لینے لگی گویا کہ اسکے اندر سے کوئی اسے کہہ رہا تھا۔" اگر یہ کاغذ کے پھول بنا سکتا ہے تو تم کاغذ کے لفافے بنا کر اسکا ساتھ دے سکتی ہو۔ یہ گونگا ہے تو کیا ہوا۔تم اسکی زبان بن جاؤ۔ یہ زندگی سے ناامید ہوا ہے۔تم اسے جینا سکھا دو تم اپنے دکھ کو خوشی اور لاچاری کو فرض جان کر عورت پن کی ایک اور مثال اس دھرتی پر قائم کرو، اگر تم نے ایسا ہی کیا تو ،تم عورت کے بارے میں غلط رائے قائم کرنے والے پر ایک زور کی تھپٹر لگاؤ عورت کو بے وفا کہنے والے کی تم زبان کھینچ لو عورت کی طرف غلط قدم اٹھانے والے کی تم ٹانگیں توڑ دو اور اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر تم ہنسی خوشی سے آگے بڑھو"

اور آگے بڑھ کر جب اس نے کاغذ کا ایک پھول اپنے ہاتھ میں لیا تو نوجوان کی طرف بولی" یہ پھول کتنے پیسے بیچتے ہیں آپ؟"

نوجوان نے اسے سرتاپا بغور دیکھا نظروں سے نظریں ٹکرائیں آنکھوں سے آنکھیں چار ہوتیں اور دونوں کی گردنیں لمحہ بھر کے لئے جھک گئیں۔سلیم نے دوبارہ اسکی طرف دیکھا تو اسے دوشیزہ آنکھوں میں پیار کا ساگر دکھائی دیا۔قریب تھا کہ وہ اس پیار کے ساگر میں ڈوب جاتا اس نے اپنے آپ کا جایزہ لیا اور وہ اپنے آپ سے بولا۔

" یہ میرا وہم ہے ،زبان کھو جانے کے بعد اب مشاہدہ بھی کھو چکا ہوں ۔"

صفیہ اسکے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر معصومیت سے بولی۔

"نہیں! آپ کا مشاہدہ غلط نہیں۔

نو جوان حیران ہوا اور من ہی من میں بولا۔ "یہ میری قوت متخیلہ ہے یا حقیقت؟"

"یہ سب حقیقت ہے"۔ صفیہ اسکے چہرے کی رنگت دیکھ کر فوراً بولی۔

سلیم مجسمہ حیرت بن کر اسے دیکھنے لگا۔ صفیہ نے پھول کو ہلاتے ہوئے پوچھا۔ "بتائے کیا ہے اسکی قیمت؟"

نو جوان اشارے سے بولا۔ "اس پر قیمت کی لیبل لگی ہے۔ ویسے تم اسے لینا کیوں چاہتی ہو یہ تو کاغذ کا پھول ہے۔ اس میں صرف رنگ ہے خوشبو نہیں۔"

"اگر اس میں خوشبو ہوتی تو ساید ہی میں یہ لے لیتی، میں یہی پھول لے لوں گی اگر یہ تمہارا اپنا پھول ہے۔"

سلیم نے اشارے سے کہا۔ "ہاں یہ تو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے لیکن تم اس کو لے کر کیا کرو گی؟"

"میں" اس نے نہایت درمذانہ انداز میں کہا میں اسکی خوشبو بن کر اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے کے لئے لوں گی۔

سلیم کچھ سوچ کر اشارے سے بولا۔ "یہ لیکن پھول باتیں نہیں کر سکتا ہے اسی لئے اس نے قیمت بتانے کے بجائے گلے میں لیبل ڈالی ہے۔"

"اگر یہ باتیں کرنے والا پھول ہوتا تو اس قیمت کی لیبل کہا ہوتی۔ مجھے معلوم ہے یہ میری وجہ سے باتیں نہیں کرتا اب میں ہی اسکی زبان بن جاؤں گی تاکہ اسکے گلے کی یہ لیبل اٹھ جائے۔

"اس نے اشارے سے پوچھا" تم نے سوچ سمجھ کر یہ پھول لینے کا ارادہ کر لیا ہے؟"

"مجھے اپنے آپ پر پورا وشواس ہے۔

''میں تمہیں اور سوچنے کا موقعہ دیتا ہوں۔'' اس نے اشارے سے کہا۔

صفیہ فوراً بولی ''لیکن یہ اب میں آپ کو ان وسوں میں جکڑے نہیں دوں گی!''

سلیم نے اسے اشارے سے کہنا چاہا تم جلد بازی سے کام لے رہی ہو مگر صفیہ نے جھٹ اسے کہہ سنایا۔ ''سلیم! میں تمہارے پاس آتی ہوں اب میری موت ہی مجھے تم سے جدا کر سکتی ہے۔''

نوجوان اس جواب سے دنگ ہوا وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صفیہ کو دیکھنے لگا۔ اس انداز سے دیکھنے لگا گویا وہ اسے اپنے ارمان بھرے سینے کے ساتھ لگانا چاہتا تھا۔ اس نے صفیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ٹھکانے پر لیا۔ ٹھکانے پر جب اس نے لڑکی کو ہر طرح سے رضا مند دیکھا تو اسی وقت اسے اپنے ساتھ لے کر سرینگر تک کی دو سیٹیں بس کی بک کر لے آیا۔

شادی کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ سلیم کے باپ نے اس تقریب پر اپنی ساری پونجی لٹا دی۔ اس خوشی کی تقریب پر وہ اپنی پونجی کیا اپنی ساری جائداد لٹا سکتا تھا۔ سلیم زبان بصارت کھو جانے کے بعد کسی کام کا نہیں رہا۔ شادی بیاہ کے قابل نہیں رہا۔ وہ سمجھتا تھا کوئی بھی ماں یا باپ اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، چاہے وہ غریب سے غریب ہی کیوں نہ ہوں۔

سلیم کی گونگی زبان کا باپ کو ایک گہرا صدمہ تھا۔ مگر اس سے زیادہ گہرا صدمہ اسے اس وقت پہنچا تھا جب سلیم غائب ہو گیا۔ دہلی سے سرینگر واپس آ کر جب باپ نے اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کے ساتھ ایک حسین تعلیم یافتہ لڑکی دیکھی

تو اسے خوشی کی انتہا نہیں رہی ۔ وہ صفیہ کو کچھ اس طرح دیکھنے لگا تھا گویا صفیہ کوئی شہزادی تھی جس نے اپنا شوہر خود ہی پسند کرنے کے لئے دنیا بھر کے شہزادوں کو مدعو کیا تھا۔ لیکن سارے شہزادوں کی موجودگی میں اس نے اپنے نوکر کے گلے میں قیمتی ہد ڈھال کر اسکے ساتھ بیاہ کرنے کا اعلان کیا تھا اور اسی بیاہ کو تقریب آج یہاں اختتام کو پہنچی تھی۔ یعنی ملکہ نے ملازم کے ساتھ سوئمبر رچایا۔

سلیم دلہن کے کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا صفیہ نے گھونگھٹ پہلے ہی اٹھا رکھا تھا۔ مگر نگاہیں اسکی جھکی ہوئی تھیں۔ سلیم نے اسکے سامنے بیٹھ کر اور پھر اسکی ٹھوڑی پکڑ کر جب اس کا چہرہ اوپر سا اٹھایا تو اس نے صفیہ کے بجائے "دلہن" کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک ساگر لہراتا دیکھا جس ساگر میں اس کی آرزوئیں تمنائیں اور چاہتیں ڈوب رہی تھیں۔ موجوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ شاید وہ سلیم کے بجائے "دلہا" کی اس زبان کے لئے رو رہی تھی جس زبان سے آج کی رات وہ رہی باتیں سننا چاہتی تھی جو ہر دلہن اس رات سننے کی متمنی ہوتی ہے۔

"تم روتی ہو صفیہ!" سلیم نے اس اشارے میں شکوہ۔ "اسی لئے تو میں نے تجھے سوچنے کا موقع دیا تھا۔"

اس اشارے پر صفیہ نے سلیم کا چہرہ پکڑ کر اس کا ماتھا کچھ اس طرح چوما گویا وہ بھی گونگی بن کر اسے کہہ رہی تھی۔

"میں کوئی شکایت نہیں کر رہی ہوں۔ میرے سرتاج میری آنکھوں میں یہ خوشی کے آنسو ہیں۔"

سلیم نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ دلہن کے روپ میں صفیہ کا بغور جائزہ

لینے لگا اور اس کے وجود کا معائینہ کرنے لگا۔ صفیہ نے آہستہ سے کہہ دیا'' ۔ یہ زیورات یہ قیمتی کپڑے یہ سب میں تمہاری زبان پر لٹادوں گی۔''

سلیم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، گویا وہ کہہ رہا تھا''اگر پھر بھی میں یہ بات نہ کر سکا''

''نہیں! مجھے دکھ ہورہا ہے۔ تم ضرور بات کرو گے سب کچھ لٹ جانے کے بعد بھی اگر تمہاری زبان واپس نہ آئی تو میں''

سلیم نے فوراً اسکے منہ پر اپنا ہاتھ رکھدیا۔

دونوں ایک دوسرے کو بیقرار نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں باتیں کر رہے تھے ایک دوسرے کو چھو رہے تھے۔ گڑگڑا رہے تھے۔ غرض اس رات کا لطف اٹھا رہے تھے جس کا نام سہاگ کی پہلی رات ہے۔ اس طرح دوسری، تیسری، چھوتھی پانچویں، چھٹی اور ساتویں رات آتی اور گذر گئی مگر ان راتوں میں کبھی رخصتی کا ذکر نہ آیا کیونکہ صفیہ یہاں سے رخصت ہونے کے لئے نہیں آئی تھی۔ اس نے سلیم کے لئے اپنے والدین اور گھر بار کے ساتھ وطن چھوڑ دیا تھا۔

سلیم اسے اپنی جان سے بھی عزیز جان کر اس کی قدر کر رہا ہے۔ سلیم کا باپ اس کی پوجا تک کرتا ہے اور سلیم کی بہن اس کا کافی احترام کرتیہے ۔ صفیہ نے بھی یہاں کے ہر ایک کے ساتھ پڑوسیوں اور ان کے رشتے داروں کے ساتھ میل جول بڑھا کر ان سبھوں کا دل موہ ہی لیا، وہ ہر ایک کے ساتھ خلوص، نرمی و ہمدردی سے پیش آتی ہے۔ وہ اپنی نند کے ساتھ گھر کا سارا کام کاج کرتی ہے اور ہر دوسرے تیسرے اپنے شوہر کو ایک کے بعد ایک نئے ڈاکٹر کے

پاس لے جاتی اور جب وہاں سے مایوس واپس آتی تو گھنٹوں تنہائی میں سلیم کی زبان کے لئے رویا کرتی۔

جب کبھی سلیم اس کو روتے ہوئے دیکھ لیتا تو وہ جلدی جلدی آنسو پونچھ لیتی تھی اور خود ہی اسکی ڈھارس بندھا کر کہتی تھی۔

"تم کوئی فکر نہ کرو، ابھی میں ناامید نہیں ہوئی میں آج تمہیں کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔"

سلیم جانتا تھا میری زبان ہمیشہ کے لئے چلی گئی ہے اب واپس نہیں آئیگی لیکن صفیہ کے ساتھ کسی نئے ڈاکٹر کے پاس جانے سے وہ انکار نہیں کرتا تھا، اور نہ ہی وہ صفیہ کے سامنے اس بات کی شکایت کرسکتا تھا کہ تم خواہ مخواہ ڈاکٹروں اور حکیموں پر بھروسہ کر کے اپنا زر وزیور لٹا رہی ہو۔

سلیم کا باپ فوڈ کنٹرول ڈیپارٹمنٹ سے ریٹائر ہوکر اب ایک دکان پر بساطی کا سامان لے کر بیٹھا ہے۔ سلیم کاغذ کے پھول بنا کر بیچتا ہے، صفیہ اپنی نند کے ساتھ روزانہ دو چار گھنٹے کاغذ کے لفافے بنانے میں صرف کرتی ہے اور ہر ہفتے سسر کے ہاتھ ان لفافوں کو فروخت کرواتی ہے لیکن سلیم کی زبان اپنے مرکز سے جب ذرا بھی نہیں ہٹتی تو وہ دن میں ضرور ایک دو گھنٹے نکال کر اسکے لئے روتی پچھتاتی ہے اور جب کبھی وہ سلیم کو اپنی زبان کے لئے روتے ہوئے دیکھ لیتی تو پہلے اس کو خوب ڈانٹتی پھر اسکی کافی تسلی بھی دیتی۔

جب کبھی رات کو اسکی آنکھ کھل جاتی تو وہ آپ ہی آپ رونے لگتی روتے روتے جب وہ سسکیاں بھرنے لگی تو سلیم بیدار ہوکر اسے رونے سے منع کرتا تھ

اسکی ڈھارس بندھاتا اور پھر خود ہی آنسو بہانے لگتا اپنی زبان کے لئے نہیں بلکہ صفیہ کے لئے جس کا جسم فکر، غم اور پریشانی سے گھل گھل کر روز بہ روز لاغر ہو رہا ہے اسکی آنکھوں کے لئے پچھتا رہا تھا جس کا خمار سیاہ دائروں میں جذب ہو رہا۔ اس خوبصورت چہرے کے لئے آہیں بھرتا ہے جس کی سرخی اب زردی میں تبدیل ہو رہی ہے اور اس کے بعد جب بھی صفیہ اس کسی نئے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی تھی تو وہاں پر سلیم اپنی زبان کے بجائے صفیہ جسمانی کمزوری کے لئے ڈاکٹر کے پیر پکڑتا تھا۔

صفیہ سلیم کی زبان سے کچھ نہ کچھ سننا چاہتی تھی۔ اسی لئے اسکے لئے مختلف طریقے استعمال کرتی تھی۔ لیکن جب ہر ایک طریقہ ناکام ہوتا دکھائی دیا تو رونے پچھتانے کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔

سلیم کے علاوہ اسکی بہن بھی صفیہ کو سمجھاتی بجھاتی تھی۔ سلیم کا باپ بہو کا خاص خیال رکھتا تھا، وہ اس کے لئے قسم قسم کے پھل میوے اور مٹھائیاں ہر روز بازار سے لے آتا تھا، اسکی ہر ضرورت کو پورا کرتا تھا اس وقت بھی نہ جانے وہ اس کے لئے کیا لایا تھا کہ اس نے راہداری میں سلیم اور صفیہ کو دیکھا جونہی انہوں نے باپ کی آہٹ سنی دونوں کھٹکے سے چونک گئے اور تیز تیز قدموں بھاگنے لگے۔ صفیہ کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر باپ نے اسے آہستہ چلنے اور احتیاط سے قدم اٹھانے کی تلقین کی صفیہ شرمندہ ہو کر یہاں سے چلدی اور نظریں بچا کر دوڑتے دوڑتے سلیم کے پاس آتی اور ہانپتے ہوئے بولی۔ ''غضب ہو گیا!''

سلیم کے ماتھے پر ابھرتے ہوئے شکنوں نے پوچھا ''کیا غضب ہو گیا؟''

''ابا کو کیسے پتہ چلا کہ میں''

سلیم نے ایسے بھویں گھمائیں گویا وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے کیا کہا؟''

''ارے! وہ مجھ کو قدم آہستہ آہستہ اور احتیاط سے اٹھانے کی تاکید کر گئے میں تو شرم سے پسینہ پسینہ ہو گئی۔''

سلیم کچھ سوچ کر اشارے سے بولا۔ ''وہ کیا بچہ ہے اسکی بھی کوئی بیوی تھی جس سے میں تولد ہوا۔''

''لیکن ابھی تو پھر انہیں کیسے پتہ چلا؟'' صفیہ نے کہا لیکن سلیم کا جواب سننے سے پہلے اس نے ایک تیز نظر اپنی پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی ابھرنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے پیٹ کو دیکھ رہی تھی کہ سلیم نے ہاتھ سے اسے ہلکا سا دھکا کچھ اس طرح دیا گویا وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہی ہو، وہاں کیا چھپا رکھا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''تمہیں کیا چاہے؟''

مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہتے۔ ابھی مجھے اسکی کیا ضرورت تھی!'' سلیم نے منہ بنا کر اشارے سے کہا۔ صفیہ ناراض ہو گئی اور بولی۔ خدا نے بن مانگے دیا نا۔ اسی لئے کہتے ہو، مجھے اسکی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں ضرورت نہیں تو مجھے ضرورت ہے دیکھ لینا ابا جان اسے ایک منٹ کے لئے بھی اپنی گود سے نہیں چھوڑیں گے۔

''میں ابا جان کی نہیں اپنی بات کرتا ہوں''۔ اس نے اشارے سے کہا پھر گویا۔ دریافت کیا۔ اب بتاؤ بھی کیا ہے؟''

''کیوں بتاؤں جب تمہیں اسکی ضرورت نہیں جو بھی ہو میرا ہے۔''

سلیم زیرلب مسکراہت کے ساتھ گویا کہہ رہا تھا ہاں جو بھی ہوگا تیرا ہی ہے میرا کیا؟"
صفیہ منہ بنا کر بولی "مجھے اسکی ضرورت ہے۔ بن مانگے خدا نے دیا پوچھا ان سے جو اولاد سے محروم ہیں۔"
"اب بتاؤ بھی کیا ہے؟" سلیم نے پلکیں مٹکا کر اشارے سے گویا پوچھ لیا
صفیہ اوٹھے ہوئے انداز سے بولی۔ ہرگز نہیں بتاؤں گی۔"
سلیم تھوڑی دیر بعد منانے لگا "مجھے منظور ہے بتاؤ کس پر ہے"۔
"لڑکی ہے مگر تم پر ہے۔"
سلیم اشارے سے بولا "اگر لڑکی ہوگی تو وہ تجھ پر ہوگی، مجھ پر تو لڑکا ہوگا نہیں لڑکی تم پر ہوگی، لڑکا مجھ پر ہوا، اس پر میں شرط لگا سکتی ہوں
"مجھے شرط منظور ہے"۔ صفیہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے سلیم بولا"۔
صفیہ کا پیٹ ابھر چکا تھا اور وہ اس اندیشے میں گھل سہی تھی کہ پہلی باری ہے نہ جانے میں بچوں گی کہ نہیں اسے محروم سسر کی یاد بار بار ستانے لگی تھی جو پہلے ہی سے اسکے پیچھے پڑ گئے تھے کہ تم کسی لیڈی ڈاکٹر کے حوالے اپنے آپ کو کرو۔ سسر سر جی کے رحلت فرمانے کے بعد اب وہ سلیم کے ساتھ یہاں تنہا گذر بسر کر رہی تھی کیونکہ مرنے سے پہلے وہ اپنی بیٹی کو بیاہ دے چکے تھے۔ ابا جی کے قبل از وقت ساتھ چھوڑنے کی وجہ سے ان کی آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ جسکی وجہ سے مالی مشکلات کا انہیں سامنا کرنا پڑتا تھا۔ صفیہ اب رات دن لفافے بنانے میں صرف کرتی تھی لیکن جوں جوں دن قریب ہوتے آ رہے تھے وہ کام کاج سے معذور ہوتی جا رہی تھی۔ اس پر سلیم کی فکر اس کھا رہی تھی۔

سلیم کی زبان کے لئے روتے روتے اسکی نظر کمزور ہوگئی تھی۔ ابھرتے پیٹ کی طرح کام کاج کا بار قلیل آمدنی کی فکر، اور سلیم کی زبان کے ساتھ اپنی جان کے غم سے وہ نڈھال ہورہی تھی۔ اوران سارے مشکلات پر قابو پانے کے لئے وہ آنکھوں سے وہ موتی لٹادیتی تھی۔ جس پر عورت ذات کا پورا پورا حق ہوتا ہے۔ اور یہی موتی جب کبھی وہ سلیم کی آنکھوں میں یکھتی تھی تو اس کی گویا دینا ہی اجڑ جاتی تھی وہ سلیم کو ایک بچے کی طرح اپنی آغوش میں لے کر روتے روتے اسے چمکارتی اوراس کی ڈھارس بندھاتی تھی۔

اپنے کمرے کے دروازے سے باہر نکلتے ہی وہ دھڑام سے گر گیا اور طائیر مجروح کی طرح تڑپنے لگا آج وہ اپنے آپ کو ایک جابر ایک ظالم اور ایک پاپی جان رہا تھا۔ آج اسے اپنی دیانت اور شرافت اپنی ہی نظر میں ایک پاپ دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت اس کا سر گھوم رہا تھا۔ ذہن مچل رہا تھا۔ کلیجہ مسوس رہا تھا اور بدن وہ تو تھر تھرا رہا تھا۔

وہ اس وقت اپنے آپ کو واقعی اس ظالم کے ساتھ مشابہت دے رہا تھا۔ جس نے معصومیت ہمدردی اور محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے ہی خیر خواہ کا گلا گھونٹ دیا ہو، وہ اس وقت اپنے آپ کو جابر جان رہا تھا۔ جس نے آنسو بہانے والی آنکھیں نکال دی تھیں، وہ اپنے آپ کو ایسا پاپی سمجھ رہا تھا جس نے دوسروں کی زندگیاں تاریک وگھناؤنی بنادی ہیں اور یہ سب کرنے اور ہونے کے باوجود بھی اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مجھ سے یہ سب کچھ سرزد کیسے ہوا۔ میں اتنا غافل کیوں رہا۔ اس قسم کی غفلت دیکھ کر جونہی وہ اپنا جائزہ لینے لگا، تو وہ تڑپ اٹھا

زندگی میں اسے ان گنت سانحوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ مگر آج کا یہ المیہ اسے زندگی کا خطرناک المیہ دکھائی دے رہا تھا جس کا اسے گمان بھی نہ تھا لیکن اب واقعات کی طرف دیکھ کر اسے اس کا مکمل یقین ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اگر میں نے اپنی آنکھوں سے اسے روتے ہوئے دیکھا تو میں نے لاپرواہی سے کیوں کام لیا۔ اور اگر لیا تو مجھے اس کا بدلہ چکا دینا چاہیئے۔ مجھے آج ہی یہ مکان یہ جائیدار بیچ کر اسے وہ موتی واپس کر دینے چاہیئے۔ جن کو کھو کر وہ!'' یکا یک سلیم کا سر چکرایا لیکن اپنے آپکی کوئی پرواہ کئے بغیر وہ آگے بڑھا۔

صفیہ کے پاس آکر اس نے اسے دونوں ہاتھوں سے کھڑا کیا پورے طور پر کھڑے ہو کر صفیہ کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ اس چیخ سے سلیم کے وجود میں ایک زبردست بھونچال آیا اور اسی کیفیت میں اس نے صفیہ کو سہارا دیکر اسے اپنے ساتھ لیا۔

جب وہ ایک ڈاکٹر کی دوکان میں داخل ہوئے۔ تو سلیم نے اسے بنچ پر بیٹھا دیا اور خود ڈاکٹر کے سامنے کھڑا ہوا۔

ڈاکٹر نے اس سے پوچھا ''کیا بات ہے؟ تم اپنی زبان کیلئے آئے ہو، لیکن میں نے ایک بار کہہ دیا ہے وہ صحیح ہے''۔

صفیہ کے جسم میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی۔ سلیم نے نفی میں سر ہلایا اور پھر اس نے اپنی آنکھوں پر انگلیاں رکھدیں۔ ڈاکٹر اسکا مطلب سمجھا ہی نہیں اسلئے بولا۔ ''کیا بات ہے؟ تم روتے کیوں ہو؟!''

سلیم نے اسے آنکھیں دکھانا چاہا کہ اتنے میں صفیہ کی دگر آواز نے ڈاکٹر کو

اپنی طرف متوجہ کیا۔اس نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ کچھ نہیں کہہ سکتا ہے آپ تو جانتے ہیں کہ اس کی زبان نہیں اسکی زبان کے لئے میں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا مگر؟'' کہتے کہتے اسکی آواز بھرا گئی۔ اور بھرائی آواز میں بولی۔''میں نے اس کی زبان کیلئے رورو کر اپنی آنکھوں کے موتی لٹا دیئے اور اپنے آپ کو اس قابل بنا دیا کہ آج میں کسی کا سہارا لیکر یہاں تک آئی ڈاکٹر صاحب! آج یہ اپنی زبان کے لئے نہیں بلکہ میری آنکھوں کے لئے آیا ہے اس لئے کہ میں اس کی زبان کے لئے روتے روتے اب اندھی ہوگئی ہوں!'' یہ کہکر وہ خاموش ہوگئی پھر اضطراب سے بولی''ڈاکٹر صاحب آج میں اپنی آنکھوں کا علاج کرانے آئی ہوں آپ یقین کیجئے میں ہر گز اس غرض کیلئے یہاں نہیں آتی جہاں میرے سلیم کی زبان گئی وہاں میری آنکھیں بھی جاتیں تو کون سا دکھ ہے مگر ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک تمنا ایک آرزو ہے ڈاکٹر صاحب! میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ جب میں بچہ جنوں گی ڈاکٹر صاحب! تو مجھے اس کا حلیہ کون بتا دے گا۔ کیونکہ سلیم، یہ آنکھوں سے دیکھ کر بھی زبان سے نہیں کہہ سکے گا اور امیں آنکھوں سے دیکھے بغیر کیسے کہہ سکتی ہوں یہ کس پر ہے ہماری تو شرط لگی تھی۔''

ڈاکٹر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ان کا مطالعہ کر رہا ہے اور ان کے وارفتگی کا اندازہ کر رہا ہے۔

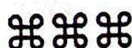
ڈاکٹر اس خاموشی پر دھیان دے کر اچانک دونوں کے دلوں میں یہ شک پیدا ہوا کہ کہیں ڈاکٹر یہ کہتا ہو کہ آپ گونگا اور اندھا ہوگا۔

ہے اور ان کے وارفتگی کا اندازہ کر رہا ہے۔

ڈاکٹر اس خاموشی پر دھیان دے کر اچانک دونوں کے دلوں میں یہ شک پیدا ہوا کہ کہیں ڈاکٹر یہ نہ کہے تمہارا بچہ گونگا اور اندھا ہوگا۔

اس اندیشے میں صفیہ اپنی آنکھیں دکھائے بغیر ایک دم کھڑی ہوگئی سلم نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا دونوں وہاں سے جلدی جلدی نکل گئے۔

ڈاکٹر انہیں واپس بلا رہا ہے لیکن دونوں میاں بیوی تذبذب کا شکار ہو کر بڑی تیزی سے چلے جا رہے ہیں تا کہ وہ ڈاکٹر کی زبان سے یہ نہ سن سکیں تمہارا بچہ گونگا اور اندھا ہوگا۔ میں اس پر شرط لگا سکتا ہوں۔



خون، آگ اور دھواں

بچاؤ، مجھے بچاؤ، ہمیں بچاؤ

رات کے قریباً گیارہ بجے یہ دہشتناک آواز خاموش فضا کے ساتھ ٹکرا کر دور دور تک پھیل گئی۔ اس وقت اڑوس پڑوس میں کچھ لوگ جاگے تھے۔ کچھ سونے کے لئے بستروں میں آئے تھے۔ دوکاندار کاروبار بند کرکے گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ مقبول چپراسی کی بیوی اس مکان کی کھڑکی سے بچاؤ، بچاؤ کے لئے پکار رہی تھی جو مکان آگ نے لپیٹ رکھا تھا۔ مقبول کی جوان بیٹی پہلی منزل کی کھڑکی سے کود کر زخمی حالت میں والدہ کو بچانے کیلئے گریہ زاری کر رہی تھی۔ فائر برگیڈ کے آنے تک اڑوس پڑوس کے لوگ پانی کے گھڑے اور بالٹین لیکر آگ کو بجھانے لگے۔ البتہ فائر برگیڈ کے آنے پر جب آگ کو نہ صرف پھیلنے سے روکا گیا۔ بلکہ اس پر قابو بھی پالیا گیا۔ جب جلے ہوئے مکان کا جائزہ لینے اور گھریلو سامان باہر نکالا جانے لگا تو دوسری منزل کے ایک کمرے میں ایک جلی ہوئی لاش دیکھی گئی، یہ مقبول چپراسی کے پڑوسی کلکیٹر آفیسر منیر احمد خان کی لاش تھی۔ یکایک پورے علاقے میں خون کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی اگرچہ اس وقت جلے ہوئے ملبے سے دھواں اٹھ رہا تھا تاہم یہی کیا گیا بچاؤ، بچاؤ کی آواز

سن کر کلیکٹر صاحب غریب ملازم کو بچانے آئے تو آگ میں بری طرح پھنس گئے اور وہ خود کو بچا نہ سکے۔

مقبول کلیکٹر کے دفتر میں کلاس فورتھ ملازم تھا۔ البتہ وہ دفتر کا ڈاک لیکر ضلع آفس پلوامہ گیا ہوا تھا۔ گھر میں مقبول کی بیوی اور بیٹی اکیلی تھیں، آگ اچانک نمودار ہوئی اور آناً فاناً پھیل گئی۔ اب آگ کے ساتھ خون کا معاملہ پورے علاقے میں شورش بن گیا۔ کل تک مقبول کے واپس آنے تک کوئی چانس نہیں تھا۔ البتہ صبح ہوتے ہی کلیکٹر منیر احمد کے بیٹے، فاروق احمد خان کو بذریعہ تار اطلاع بھیجدی گئی جو بنگلور میں انجینئر نگ کے آخری سال میں زیر تعلیم ہے۔ کلیکٹر منیر احمد نے مقبول کو اپنے دفتر میں کلاس فورتھ عہدے پر تعینات کیا تھا۔ اور وہ ان سے گھریلو کام بھی لیتا تھا۔ مقبول کی شادی کے بعد اس کی بیوی زبیدہ بھی ایک طرح سے کلیکٹر کی کوٹھی پر آیا کا کام کرتی تھی۔ کلیکٹر منیر احمد خان کے ساتھ ان کی مسز ساجدہ خان مقبول اور اس کی بیوی سے گھریلو کام کراتے تھے۔ اس کے عوض میں انہیں اس کوٹھی سے کافی مراعات مل رہے تھے۔

مقبول سے شادی کے دوسرے سال ایک بیٹی ہوئی، ڈیڑھ سال بعد ایک بیٹا ہوا جو تین سال کی عمر میں فوت ہوا۔ کلیکٹر منیر احمد خان مقبول کو ٹراولنگ الاؤنس کمانے کے لئے ضلع ہیڈ کوارٹروں پر ڈاک لیکر بھیجا کرتا تھا۔ آج جبکہ ان کے گھر کو آگ لگی، وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔ البتہ اس گھر میں کلیکٹر منیر احمد کی لاش برآمد ہونے پر مختلف قیاس آرائیاں ہونے لگیں، اکثر کی یہ متفقہ رائے تھی کہ پڑوسی کو آگ سے بچانے کے دوران کچھ واقعہ ایسا ہوا ہوگا کہ وہ خود کو بچا نہ سکا صبح

ہوتے ہی منیر احمد خان کی لاش پولیس کنٹرول روم سے لیکر پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال بھیجدی گئی۔ صبح سویرے مقبول کو ان کا گھر جلنے کی اطلاع بھیجدی گئی۔ اس کے بعد کلیکٹر منیر احمد کے بیٹے فاروق احمد کو والد کے انتقال کی اطلاع تار کے ذریعے بھیجدی گئی۔ کلیکٹر صاحب کے پڑوسی اور علاقے کے لوگ ان کی اس طرح کی موت پر پچھتا رہے ہیں اور اب فاروق احمد کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں تا کہ جب وہ واپس گھر آئے گا تو اس کی ڈھارس بندھائیں گے۔ انہیں موت اٹل جاننے کا درس دے کر تسلی دیں گے۔

مقبول چپراسی کے بارے میں اس کے گھر اور اثاثے کے نقصان کا تخمینہ لگا کر سرکار سے امداد حاصل کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ البتہ ہمسایوں کے ساتھ علاقے کے بعض صاحب ثروت افراد نے چندہ جمع کر کے فوری ضروریات برتن بستر اور لباس کا انتظام کرلیا۔ کلیکٹر منیر احمد خان کی بیوی عایشہ خان اپنے شوہر کے زندہ جل کر مرنے سے سخت دیگر تھی وہ اندر ہی اندر اس قدر بھیانک انجام پر شوہر کے مرنے پر خون کے آنسو رو رہی تھی اور اس کے ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھی، یہ واقعہ یا حادثہ پیش کیسے آگیا۔ مکان کسی کا جل جاتا، یا اپنا بھی ہوتا تو دوسرا بنایا جا سکتا، اس کے لئے جان دینے کی ضرورت کیوں پڑی موت کے منہ میں جانے کی نوبت کیوں آگئی۔ عایشہ خان سوچنے لگی، پڑوس میں آگ کی اطلاع پا کر وہ مجھ سے پہلے جاگے کیسے؟ ان کی تو نیند بڑی گہری ہوتی تھی۔ جھنجھوڑ کر جب تک تھک نہیں جاتے ان کی آنکھ کھلتی نہ تھی۔

وہ یہ بھی سوچنے لگی "ہو سکتا ہے آگ لگنے پر لوگوں کا شور سنکر وہ پہلے جاگے

البتہ ایسے موقعہ پر وہ دروازہ بند کر کے نہیں جاتے ، ایسے وقت وہ برآمد میں پڑی چپل پہن کر ہی جا سکتے"۔

جب دیر تک ان حالات اور معاملات پر سوچتے انہیں کچھ حاصل نہ آیا تو وہ سب کچھ بھول کر اپنے لٹے ہوئے سہاگ کو یاد کرنے لگی اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کلیکٹر منیر احمد خان اصل میں دیہات کا رہنے والا تھا۔ تعلیم حاصل کر کے جب ان کی ملازمت سرینگر میں لگی تو انہوں نے دیہات کو خیر باد کہہ کر سرینگر میں ہی بسیرا شروع کیا اور یہیں شادی بھی کر لی۔ اس کے دو بچے ہوئے ایک لڑکی جس کی شادی سال بھر پہلے کر دی گئی۔ ان کا بیٹا انجینئرنگ کا کورس مکمل کرنے بنگلور میں مقیم ہے۔

اپنے دفتر میں انہوں نے چپراسی محمد مقبول کو خدمت گزار کے ساتھ بڑا وفادار پایا۔ محمد مقبول نہ صرف دفتر میں بلکہ صبح و شام ان کی کوٹھی پر بھی گھریلو کام کر کے وفادار ملازم ثابت کر رہا تھا۔ گھر کا کام کرنے اور بازار سے سودا سلف لانے اور ہر وقت تابعدار بنکر رہنے پر نہ صرف کلیکٹر منیر احمد خان بلکہ ان کی مسز عایشہ خان محمد مقبول کو اپناتے رہے۔ دونوں میاں بیوی نے محمد مقبول کو اس قدر اپنایا کہ نہ صرف ان کی شادی کرادی بلکہ انہیں پڑوسی میں ایک چھوٹا سا مکان بھی دلایا۔ اگر چہ اس مکان کو خریدنے کے لئے مقبول کو اپنی موروثی جائداد اپنے بھائیوں کو بیچنا پڑی اور بنک سے Loan بھی لینا پڑا ، البتہ ان کا اپنا گھر بن گیا اور اس گھر میں اس کی شادی شدہ زندگی بھی شروع ہو گئی۔ اب تو مقبول کے ساتھ اس کی

بیوی زبیدہ بھی منیر احمد خان کی کوٹھی کی گویا ملازم بن کر رہے۔ محمد مقبول کی بیوی نے عایشہ خان کا ہاتھ بٹانے اور اس کی خدمت وتابعداری کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اس طرح محمد مقبول کے ساتھ اس کی بیوی کلیکٹر منیر احمد خان اور عایشہ خان کے چہیتے بن گئے۔ شادی کے بعد محمد مقبول کے تین بچے ہوئے ان میں سے صرف پہلی بیٹی زندہ بچ سکی باقی دونوں جنم کے ساتھ ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان کی اکلوتی بیٹی نسرین اب تو بالغ ہو چکی ہے اور منیر احمد خان نے نسرین کی شادی بیاہ کا سارا خرچہ اٹھا لینے کا ذمہ لیا تھا۔ منیر احمد خان نسرین کو اپنی بیٹی مان کر پڑھاتے اور پالتے تھے۔ ان کی ضروریات زندگی پورا کیا کرتے تھے۔ چونکہ اب وہ نہیں رہے اسلئے یہ خواب چکنا چور ہو گیا۔

بنگلور سے فاروق کی آمد پر یہاں ماتم وہی صورت اختیار کر گیا جس کا پہلے سے ہی اندازہ ہو رہا تھا تعزیت پرسی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا جو چند روز تک جاری رہا۔ گھر اور اس کا اثاثہ جلنے کے بعد محمد مقبول بود وباش کے لئے سسرال منتقل ہو گیا تھا۔ البتہ فاروق احمد نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ محمد مقبول اور اس کی بیوی زبیدہ ان کی بیٹی نسرین کو اپنے گھر لے آیا۔ یہاں انہیں رہنے کے لئے کوٹھی کے احاطے میں ایک علیحدہ کوارٹر میں رکھا جب تک کہ انہیں سرکاری ریلیف ملے اور وہ نیا مکان بنوا سکیں۔ کوارٹر میں منتقل ہونے کے بعد زبیدہ اور مقبول دونوں کوٹھی میں گھریلو کام میں دوبارہ ہاتھ بٹانے میں لگ گئے۔

نئی سرے سے زندگی کی شروعات شروع ہو گئی۔ نسرین میٹرک کا امتحان پاس کر چکی ہے۔ البتہ وہ نہ صرف اپنی عمر سے بڑی الگ رہی ہے بلکہ پھر پورا

جوانی اور حسن کی پری، فاروق احمد خان اس پر لٹو ہو گیا۔ اس نے من ہی من میں نسرین کو جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ انجینئرنگ کا کورس مکمل کرنے کا فاروق خان کا یہ آخری سال ہے۔ اور بنگلور جانے سے قبل فاروق خان نے نسرین کے ساتھ بیاہ کرنے کا فیصلہ محفوظ رکھا۔ البتہ نسرین کو اعتماد میں لینے، نسرین کو اپنانے، اس کے دل میں اپنی محبت جگانے کے لئے اس نے وہ سب حربے آزمائے جس کی انہیں ضرورت محسوس ہوئی۔

فاروق خان کی محبت کو نسرین نے اپنے لئے ایک ایسا اعجاز مانا، جس کی وہ توقع بھی نہ کرسکتی، فاروق کی آفر کو وہ اپنے لئے ایک معجزہ سے کم نہ سمجھی اس نے محبت کا جواب پیار سے دیا۔

بنگلور روانگی سے قبل فاروق خان نے زبیدہ کو اپنی کوٹھی کے لان میں لا کر اپنے سامنے کرسی پر بٹھا دیا اور پوچھ لیا۔

''تم اس قدر اداس اداس کیوں، رہتی ہوا! میرا گھر جلا، سب لٹ گیا اس پر اداس نہ رہوں تو کیا کروں!

''گھر جلا تو دوسرا بن سکتا ہے۔ نئی زندگی گزاری جاسکتی ہے البتہ جو مر گیا وہ واپس نہیں آسکتا''۔ فاروق خان نے اسے سمجھا دیا۔

''آپ کے والد نے ہمارے لئے جان کی قربانی دیدی، اگر وہ اس طرح دلدوز حادثہ کا شکار نہ ہوتے تو ہمارے لئے نیا گھر بنا کر دیتے۔''

''اس بارے میں تمہیں ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہیں نیا گھر بنا کر دوں گا۔ میں تمہاری کھوئی ہوئی خوشیاں واپس لوٹا دوں گا۔ کیونکہ میں اس باپ کا بیٹا

ہوں جن کی سخاوت ایک مثال ہے''۔

''میں جانتی ہوں اور مانتی بھی ہوں۔ خان صاحب کی جدائی برداشت سے باہر ہورہی ہے۔''

''قدرت کے فیصلے کے آگے انسان بے بس ہے۔ میری مانو تم اس طرح اداس رہنا چھوڑ دو، ماضی کو بھول جاؤ، میں ایک سال کے بعد واپس آکر سارا کچھ بدل کر رکھوں گا۔''

''آپ کب جارہے ہیں۔''

''چندروز کے بعد جانے کا ارادہ ہے۔''

چھٹی کے اب تین دن باقی رہ گئے تھے۔ ان دونوں میں فاروق وہ کام پختہ کر کے جانا چاہتا تھا جس کو کرنے کیلئے اس نے عہد کیا تھا۔ لیکن اس کام کی تکمیل کے لئے اسے ماں کے سہارے اور اس کی اجازت کی ضرورت تھی۔ اس لئے اب ماں کے سامنے بات چھڑنے کا سوال تھا۔ یہ سوال پیچیدہ اس لئے ہورہا تھا کہ اسے ماں سے یہ بات کہنے کی جرات نہیں ہورہی تھی۔ اس تذبذب کے باوجود اب وہ اس بارے میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا اور نہ ہی اس معاملہ کو اور وقت کے لئے ملتوی رکھنے کا موقع تھا۔ آخر بات دل میں طے کر کے وہ ماں کے پاس آیا۔ پہلے اسے بہلایا، پھسلایا پھر نسرین کے ساتھ بیاہ رچانے کے لئے ماں کو راضی کر لیا، ماں کا اذن پا کر وہ نسرین کے پاس آیا، اس وقت وہ عجلت میں تھا۔ ان کے اندر کے حالات چہرے پر عیاں تھے۔ نسرین نے انہیں اس حال میں دیکھا تو پوچھ ہی لیا۔

"آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں، کیا بات ہے؟"

ارے تم بات کی پوچھ رہی ہو میں......

میں پوچھ رہا ہوں تمہاری......کہاں ہے"

"کیا کرے گی؟"

مجھے اسے ایک ایک خوش خبری سنانی ہے

"کون سی خوش خبری؟"

"وہ......وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔لیکن جب تم بھی سنو گی تو خوشی سے جھوم جھوم جاؤ گی۔"

"اب بتاؤ بھی ان اداؤں کے بغیر"۔

"نہیں تم کو نہیں بتاؤں گا۔ بتاؤ تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"وہ وہیں گئی ہے جہاں روز جاتی ہے اپنی جلے ہوئے مکان کو دیکھنے"

"کیوں گئی ہے اس کا گھر تو پھر آباد ہوا ہے، اچھا میں وہیں جاتا ہوں" یہ کہہ کر وہ واپس مڑا ہی تھا کہ نسرین نے اس کا دامن پکڑ لیا اور کہا

"میں نہیں چھوڑوں گی تب تک......"

نسرین کی اس ادا سے فاروق نڈھال سا ہو گیا اور کن آنکھوں سے دیکھکر بولا چھوڑو، بتاؤں گا"

"بتاؤ لیکن ناز و نخروں کے بغیر۔"

"تو سن لو کان کھول کے سن لو۔ آج میں نے تمہارے "کاش" کو ڈھا دیا اور میں تیرا ہو چکا"۔

''سچ!'' نسرین واقعی خوشی سے جھوم اٹھی

''ہاں تمہاری قسم سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے اپنی ماں کو تمہیں بہو بنانے کے لئے کہا۔ وہ مان گئی اب میں تمہاری ماں کو یہ خوش خبری سناؤں گا وہ خوشی و مسرت سے باغ باغ ہو جائے گی''۔ ان کی اکلوتی بیٹی مرحوم خان صاحب کی بہو بنے گی اس خبر سے وہ ماضی کے سارے دکھ بھول جا گی۔ نئی خوشیوں میں ڈوب جائے گی۔

''ہاں وہ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھے گی''، نسرین نے جواب دیا، فاروق ایک ادا سے بولا'' وہ جلا ہوا گھر جہاں اس وقت وہ بیٹھی پچھتا رہی ہو گی۔ اس خوشی کی خبر کو سنکر اس کا سوختہ مکان محل بن جائے گا اور وہ کوئلے سیاہ کوئلے اس کے سامنے رنگین پھول بن جائیں گے۔ اور وہ تمام دکھ، درد اور مصیبت بھول کر خوشی و مسرت سے لبریز ہو جائے گی اور اسی کیف میں ہم دونوں کو خوشی خوشی جینے کی دعائیں دے گی۔

''اچھا تو اب جاؤ۔ یہ قصیدہ خوانی یہاں کب تک کرو گے؟''

تم جانے کی اجازت دیتی ہو!''

نسرین آہستہ سے مسکرا دی۔ فاروق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا اور پھر مڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا یہاں سے چلدیا۔

نسرین کی ماں زبیدہ اس وقت سوختہ لکڑیوں کے بیچ لمبے کو ہاتھوں سے ہٹا کر نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ اتنے دن گذرنے کے باوجود اسے مکان کے جلنے کا قلق باقی تھا۔ فاروق جب اندر آیا تو اس نے زبیدہ کو روتے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے پر غم و الم کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس کا بدن دکھ اور مصیبت کے

شدید احساس کا آماجگاہ تھا۔فاروق نے اسے اس حال میں دیکھا تو اس کا موڑ ہی بگڑ گیا۔ پھر بھی اس نے ہلکی سی آواز نکالی زبیدہ نے چونک کر گردن اوپر اٹھائی ۔فاروق پر نظر پڑتے ہی وہ ہکلائی اور بولی۔

''آ...... آپ یہاں؟''

''ہاں! میں نے گھر میں سنا تم یہاں آئی ہو؟ کہہ کر وہ خوموش ہوا، اور دوسرے لمحے تیور بدل کر شکایت آمیز لہجے میں بولا'' یہ تم کیا کر رہی ہو؟۔

''اس طرح مکان کے ملبے کو دیکھ دیکھ کر تم اپنی جان گنوانا چاہتی ہو کیا؟''

زبیدہ کچھ کہتے رک گئی۔فاروق آگے بڑھا اور اس کے قریب ہی ٹیلے پر بیٹھ کر بولا۔

''ہماری طرف دیکھو، تم سے کچھ کم دکھ ہمیں نہیں ہوا ہے؟ مگر ہم یہ سب بھول کر جی رہے ہیں۔کیا کر سکتے ہیں۔جینے کا تو تقاضا یہی ہے۔''

''بیٹا! میں بھولنے کی کوشش کرتی ہوں۔مگر بھول نہیں پاتی۔کسی کے گھر میں رہ کر اپنے گھر کی یاد آتی ہی ہے۔''

''کسی کے گھر میں کیا، وہ تو تمہارا اپنا گھر ہے۔''

''ہے تو سہی لیکن......

''لیکن ویکن کو چھوڑو، اگر تمہیں اس میں کچھ شک ہے تو میں تمہیں ایک خوش خبری سنا کر یہ شبہ ہی دور کر دیتا ہوں۔''

زبیدہ نے اس کی طرف حیرت مگر اشتیاق بھری نظروں سے دیکھا۔

فاروق تھوڑی دیر بعد حجاب اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں بولا'' میرے

خیال میں اب تم سب کچھ بھول کر ہمارے گھر کو اپنا گھر جان لو کیونکہ اب ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آرہے ہیں۔

زبیدہ نے مطلب سمجھنے کی کوشش کی۔ فاروق بولا۔

''میرا مطلب ہے یہ اب...... تمہاری بیٹی ہمارے گھر کی بہو بن رہی ہے

زبیدہ بھونچکا سی رہ گئی۔ اس کی زبان گنگ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے روشنی گویا چھین گئی۔ وہ ایک بت بنی پلک جھپکائے بغیر فاروق کی طرف دیکھنے لگی۔ فاروق نے جو سوچا تھا وہ بالکل نہیں ہوا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر حیران اور ششدر ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد بولا میری بات شاید تم اچھی طرح نہیں سمجھی۔

''کاش''! وہ سب غلط ہو جو میں سمجھتی ہوں۔''

فاروق طویل وقفے کے بعد بولا۔ تم نے بہو سے نہ جانے کیا مراد لیا۔

دراصل بات یہ ہے کہ میری ماں نسرین کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتی ہے۔

''نہیں''! وہ چیخ پڑی ''یہ نہیں ہوسکتا، یہ آپ لوگوں نے مجھ سے کہے پوچھے بغیر کیا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں آج ہی ابھی تمہارے گھر سے نکل بھاگتی ہوں۔''

''آخر کیوں؟ ہم میں کیا برائی ہے مجھ میں کیا خامی ہے؟''

''ہم تمہارے ساتھ اس رشتے کے قابل نہیں ہیں۔ ہرگز نہیں ہیں کہاں آپ اور کہاں ہم''

''لیکن میں، میں غریبی اور امیری کی تفریق مٹا کر تمہیں اس رشتے کے قابل بنادوں گا۔ ویسے غریب لوگ امیروں کے ساتھ رشتہ کرتے وقت انکار نہیں کرتے بلکہ انہیں تو خوشی ہوتی ہے۔

''بیٹا یہ امیری اور غریبی کا سوال نہیں''

''پھر کیا سوال ہے؟''

''کوئی سوال نہیں کوئی جواب نہیں، آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کہیں میں پاگل ہو رہی ہوں''

''آخر کیوں؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے''

''ہاں بیٹا! مجھے خوش ہونا چاہیے تھا مگر...... مگر میں...... بیٹا! تم مجھے اس کے لئے مجبور نہ کرو، میں آج ہی تمہارے گھر سے ڈیرہ اٹھا لیتی ہوں''

''لیکن تم جاؤں گی کہاں جب تک کہ تمہارا اپنا گھر نہ بنے۔''

''گھر ہمارا بنے یا نہ بنے لیکن اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔''

''کیا ہم اتنے برے اور نیچ ہیں۔''

''ایسا نہ کہ بیٹا، نیچ ہم ہیں، برے ہم ہیں، کم ذات ہم ہیں'' اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا اور رونا شروع کیا۔

فاروق سخت پریشان ہوا، اس نے جو سوچا اور خیال کیا تھا اس کے بالکل برعکس یہاں ہوتے دیکھکر وہ پریشان ہوا، آخر کچھ دیر کے بعد سکوت توڑ کر بولا۔

''زبیدہ! کیا تم کو اس بات کا احساس ہے کہ نسرین کو اپنی بیوی بنا کر میں ایک قربانی دے رہا ہوں۔ لیکن جو ازل ہی سے بدنصیب ہوں۔ ان کے لئے قربانی دینا یا ان کے لئے خوشی مہیا کرنا میرے خیال میں ایک بہت بڑا پاپ ہے کیونکہ تم نے کچھ ایسا ہی طریقہ اختیار کیا، تم شاید یہ نہیں جانتی کہ میں عنقریب

انجینئر بننے والا ہوں اور ایک مرحوم کلکٹر کا بیٹا بھی ہوں۔ اس حیثیت سے مجھے بڑے بڑے امیر ورئیس اپنی بیٹی دیتے ہوئے فخر کرینگے مگر تم......اور تم انکار کر رہی ہو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ تمہیں کس بات کا گھمنڈ ہے؟''

''بیٹا! ایسا نہ کہو۔ ہمیں طعنے نہ دو، ہمیں غلط نہ سمجھو، میری مجبوری کی کوئی قدر کرو۔''

''ایسی کونسی مجبوری ہے؟ جو اس کام میں رکاوٹ بن رہی ہے۔''

''تم بھی مجھے اس کے لئے زیادتی کرنے کیلئے مجبور نہ کرو۔ تم جانتی نہیں۔ میں نے کتنی مشکل اور کتنی منت زاری سے اپنی ماں کو اس کے لئے راضی کیا۔ اگر وہ انکار سن لے گی تو کیا کہے گی۔ وہ مجھے کس نظر سے دیکھے گی؟''

''نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، میں تمہارے لئے اس کے پیر پڑوں گی، میں ان سے اسی غلطی کی معافی مانگ لونگی۔''

''تمہیں ایسی کونسی مجبوری ہے، جو تمہیں راضی ہونے سے روک رہی ہے''

''بیٹا! مجھے مجبور نہ کرو خدا کیلئے، میں بدنصیب ہوں مصیبت کی ماری ہوں''

مگر تم اپنا نصیب خود بگاڑ رہی ہو۔

''مجھے ایسا ہی کرنے دو، خدا کے لئے مجھے بگڑنے دو!''

''اگر یہ بات ہے تو پھر تو مجھے یہ سب باتیں تمہارے شوہر مقبول کو بتا دینی چاہیئے۔''

''نہیں''! زبیدہ نے اس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور عاجزی سے بولی ''میں تمہیں وہاں جانے نہیں دوں گی''۔

''کیوں نہیں جانے دوگی؟'' اس نے گھورتے ہوئے کہا، زبیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا''۔

فاروق ایکدم کھڑا ہوا اور تیور بدل کر بولا ''دیکھو مجھے آپ لوگوں پر رحم آیا تھا۔ اسی لئے میں اس کے لئے اپنی ماں کو مجبور کر چکا۔ اگر مجھ پہلے پتہ ہوتا تو میں اس خیال کو کبھی جنم بھی نہیں دیتا لیکن اب میں مجبور ہوں اس لئے کہ ماں کے سامنے میری قدر و قیمت گر جائیگی میں اب مقبول کے پاس جاؤں گا مجھے پوری توقع ہے وہ تمہاری طرح انکار نہیں کریگا۔

''ہاں بیٹا! وہ انکار نہیں کرے گا۔ لیکن میں یہ کام نہیں ہونے دونگی!''

''میں یہ کام کر کے رہوں گا۔''

''نہیں'' وہ چیخ پڑی۔''

فاروق غصہ سے آگے بڑھا زبیدہ نے گرتے گرتے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انکساری سے کہا ''بیٹا! ایسا نہ کرو، یہ شادی نہیں ہو سکتی''۔

''کیوں نہیں ہو سکتی؟''

''مجھے اس کے لئے مجبور نہ کرو میں ایک عورت ہوں میں تمہارے پیر پڑتی ہوں۔''

''تم مجھے اپنی مجبوری بتاؤ میں اس راستے سے ہٹ جاؤں گا۔''

''بیٹا! مجھے مجبور نہ کرو، خدا کے لئے ایسا نہ کہو!''

''میں یہ مجبوری سنتے ہی راستے سے ہٹ جاؤں گا اگر تم نہیں بتاؤ گی تو میں یہ شادی ضرور کروں گا کسی بھی قیمت پر۔''

''بیٹا! تم میری رسوائی پر کیوں تلے ہوئے ہو!''

''اس میں کونسی رسوائی ہے میں تمہاری بیٹی سے بیاہ کرر ہاہوں''۔

''رسوائی نہ ہوتی تو میں منکر کیوں بن جاتی!''۔

''لیکن میں سنے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔''

''میں......میں بھی......اب میں بھی کہے بغیر واپس نہیں جانے دوں گی۔ مگر میرے سامنے وعدہ کروں، میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔''

فاروق دنگ سارہ گیا اور اسی انداز سے بولا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں''۔

زبیدہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

فاروق نے آگے بڑھ کر اسے جھنجھوڑا اور بولا، ''بتاؤ نا کیا بات ہے؟''

''کیا بتاؤں بیٹا!'' وہ بھرائی آواز اور پریشان لہجے میں اسکی طرف بولی یہ رشتہ نہیں ہوسکتا اس......اس لئے کہ...... بیٹا! اس کی آواز کانپنے لگی، اس کا جسم تھر تھرانے لگا۔ اس کے چہرے پر سیاہی جیسی پھیل گئی۔ اسکی آنکھوں میں رسوائی کی لکیریں ابھر آئیں اور وہ لرزتے کانپتے تھر تھراتے بولی'' بیٹا! نسرین......وہ......وہ تیری......!''

یکا یک ایک آگ لگی، خون ہوا دھوں اٹھ گیا۔

فاروق کے ساتھ زبیدہ بھی دیکھ رہی تھی، اس دھرتی پر عزت و آبرو کا ایک خون کا دریا سا بہہ رہا تھا۔ یہاں عزت و عصمت کو آگ لگ رہی تھی۔ یہاں تہذیب اور رشتے سے دھواں ہی دھواں اٹھ رہا تھا۔

فاروق خجالت سے سکڑ رجا رہا ہے۔ زبیدہ رسوائی سے ملول ہو رہی ہے۔ وہ نیچی نگاہیں کر کے ملبے میں ہاتھ ڈال کر بدقت بولی۔

''سب لوگ جانتے ہیں آپ کے ابا جان نے آگ میں کود کر ہم کو بچا لیا۔ اس طرح ان کی موت ایک شہادت ہے۔ مگر بیٹا، وہ آگ میں جل کر مر گیا، شاید اس کی یہی سزا تھی''۔ اور میری سزا......

وہ پھر رو پڑی اور پھر آنسو پونچھتے ہوئے بولی، خان صاحب اس رات بھی میرے ساتھ سوئے ہوئے تھے۔ جس رات ہمارے گھر کو اچانک آگ لگی آپ کے والد اور میرے درمیان کا یہ سلسلہ پندرہ سال پرانا ہے۔ یوں جان لیں جب میں دلہن بنکر مقبول کے لئے لائی گئی میری پہلی اولاد نسرین خان صاحب کی بیٹی ہے مقبول سے جو دو بچے ہوئے وہ دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہماری صرف یہی ایک بیٹی زندہ بچ گئی جس کو مقبول اپنا جان کر پال رہا ہے۔ جبکہ میں بخوبی جانتی ہوں نسرین خان صاحب کی بیٹی ہے اور تمہاری بہن!

''او، یہ میں کیا سن رہا ہوں، تم نے مجھ سے پہلے یہ کیوں نہ بتایا؟'' اب میں تم سے کیا بتاؤں، ہم بہن بھائی نے اس رشتے کو ناپاک کیا ہے''۔

یکا یک آگ بھڑک اٹھی، رشتے کا خون ہوا، اور دھواں اٹھ گیا۔



ایک زخم

اور سہی

حصہ دوئم، غیر مطبوعہ

(اضافی افسانوں کا حصہ)

ترتیب

انتساب

نامور رائٹر پرڈیوسر ڈائرکٹر
پران کشور
کے نام عزت احترام کے ساتھ
پران کشور میرے ریڈیو ڈرامے
خود پرڈیوس کرتے اور اوما کھوسلہ
کے ساتھ ڈراموں میں خود
پارٹ ادا کرتے رہے۔

شبنم قیوم

ایک زخم اور سہی

اس کتاب میں جو یہ چار طویل افسانے (۱) یادگار (۲) پانی کا دھواں (۳) گواہی کے تھپیڑے (۴) کلائمکس شامل کر لئے گئے ہیں۔ یہ ان 12 افسانوں میں شامل ہیں جن کے ریڈیو ڈرامے بنا کر براڈ کاسٹ کئے گئے۔ یہ چاروں ریڈیو ڈرامے بہترین ریڈیو ڈرامے قرار دئے گئے۔ ماضی میں ریڈیو کشمیر سے ڈراموں کے چلن کے دوران میرے کل 28 ڈرامے براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ان چاروں ڈراموں کا ریکارڈنگ بیرون ریاست کے ریڈیو اسٹیشنوں کو براڈ کاسٹ کے لئے سرینگر ریڈیو اسٹیشن سے بھیجی گئی۔

شبنم قیوم

یادگار

کار بڑی تیز رفتاری سے جارہی ہے۔لیڈی ڈاکٹر نیلوفر ایک نظر سے ماجد خان کو اور دوسری نظر اس لمبی اور کشادہ سڑک کو دیکھ رہی تھی جس پر ماجد خان کار کو بڑی تیز رفتار سے دوڑا رہا تھا۔کار کو اس طرح دوڑانے پر ڈاکٹر نیلوفر معترض ہو سکتی اگر اسے اس بات کا احساس نہ ہوتا۔اس وقت اس کے گھر میں اسکی بیوی زندگی اور موت کے درمیان لٹکی ہے۔بلیواڈ کی اس سڑک پر ٹریفک حسب معمول تھا۔البتہ سب اپنے اپنے حال پر آجا رہے ہیں۔ایک ماجد خان ہیں جو ایک کشمکش لیکر گھر کی جانب جارہے ہیں اور جلدی جلدی گھر پہنچنا چاہتے ہیں۔بلیوارڈ روڈ پر بوچھوارہ جانے والی سڑک کے گراسنگ پر پہنچتے ہین ماجد خان نے کار کی بریک ایکدم لگادی۔ماجد خان کے ساتھ ڈاکٹر نیلوفر کو ایک جھٹکا لگا۔ماجد خان نے کار کی کھڑکی کھولدی نیچے آیا۔کار کے اگلے پچھلے ٹائروں کو دیکھا ادھر ادھر نظر دوڑائی کچھ ڈھونڈنے لگا۔البتہ نامراد ہوکر واپس کار میں آیا کار سٹاک کی اور روانہ ہوا۔ڈاکٹر نیلوفر جو جھٹکا کھانے کے بعد اب ذرا سنبھل گئی تھی انہوں نے ماجد خان سے پوچھا۔

''آپ اچانک یہاں کیوں رک گئے باہر جاکر کیا دیکھ رہے تھے؟''

''وہ لاش دیکھ رہا تھا شاید اسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہے''۔

لاش کا نام سنکر ڈاکٹر نیلوفر کو ایک اور جھٹکا لگا ''لاش......

کونسی لاش...... کس لاش کو کوئی، اٹھا کر لے گیا؟''

ماجد خان نے کوئی جواب نہیں دیا جب ڈاکٹر نیلوفر نے اصرار کیا تو وہ سوال گول کر کے بولا ''کیا آپ کو پورا بھروسہ ہے میری بیوی سے جو اس وقت بچہ تولد ہوگا۔ وہ لڑکی نہیں لڑکا ہوگا''۔

''ہاں! یہ میرا تجربہ ہے، لیکن وہ لاش؟''

''یہ دیکھتے، ہم ٹھکانے پر پہنچ گئے''۔

کار رک گئی دونوں بڑی پھرتی سے کار سے باہر آ گئے اور......

16 سال قبل کا یہ واقعہ ماجد خان کو ایسے یاد آ گیا جیسے یہ کل کی نہیں بلکہ آج کی بات ہو،

اپنے نام کی آواز پر وہ چونک گیا۔ اس نے اس ناول کو بند کر کے رکھ دیا جس کو وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ کیونکہ یہ اس کے افسانہ نگار اور ناول نگار دوست شوقین کشمیری نے لکھا ہے۔ ناول رکھکر تیز تیز قدموں سے بیوی کے چیخنے چلاتے پر وہ دوسرے کمرے میں آیا، اس نے دیکھا اس کی بیوی بیڈ پر کراہ رہی ہے اور اضطرابی حالت میں کہہ رہی ہے۔ ''ماجد! مجھے بچاؤ، مجھے کسی طرح بچاؤ، ورنہ میں مر جاؤں گی، تم فوراً جا کر کسی ڈاکٹر کو لے آؤ، میں نے زہر کھا لیا ہے، مرنے کے لئے مگر اب میں مرنا نہیں چاہتی۔ میں نے ارادہ بدل دیا، مگر زہر کھا لیا ہے۔

نزہت! یہ تم نے کیا کیا کیوں کیا''؟

''میں اور کیا کرتی میرے ماجد! مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی، میں متواتر سولہ سال سے یہ زہر کھاتی آئی ہوں۔ آج اس زہر نے اپنا اثر دکھایا، مجھے کسی طرح بچاؤ تا کہ میں اپنی اولاد کو وہ الفاظ واپس لینے کے لئے مجبور کرسکوں جن الفاظ نے مجھے زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔ میں نے اسے تمہارے لئے قربانی دینے کے لئے کہا تھا مگر......، میں یہ کس سے کہہ رہی ہوں۔ یہاں تو کوئی نہیں ہے''۔

کافی مسافت طے کر کے ماجد خان اپنے آپ کو اس بات پر کوسنے لگا کہ میں نذہت کے لئے ڈاکٹر لے آنے کے بجائے اسے ہی اپنی کار میں بٹھا کر کیوں نہیں لے آیا تا کہ اسٹیٹ ہسپتال لیجا کر اس کا اسٹامک واش کیا جاتا، نزہت کی جان بچانے کی فریاد نے مجھے وہاں یہ سوچنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ لیکن اب ......، مجھے کسی بھی صورت میں نزہت کو بچانا ہے۔ چاہے اس کے لئے اپنی جان کی قربانی بھی کیوں نہ دینا پڑے، مجھے وقت ضائع کئے بنا، چلا جانا چاہے اور ڈاکٹر کو اپنے ساتھ گھر لانا پڑے گا۔ اب اس وقت میں بلیوارڈ روڑ پر بوچھوارہ کراسنگ پر کار کو نہیں روکوں گا اور نہ ہی کار سے اتر کر اس لاش کو ......یکا یک اس نے کار کو بریک لگایا بریک لگانے کے باوجود ایک جوان لڑکا اس کی کار کے ساتھ ٹکرا کر دور جا گرا،

''اف! یہ کیا ہوا، کیوں ہوا، مجھے باہر آ کر اس لڑکے کو اٹھا لینا ہے۔ اس کو اٹھا کر ہسپتال لیجانا ہے۔ اس لڑکے کو بچانا ہے......مگر میری نزہت، وہ......اتنی دیر

تک، اگر وہ میرے انتظار نہ کر سکی اور اگر وہ اتنی دیر میں مر گئی، او میرے خدایا میں کیا کروں، کدھر جاؤں"۔ وہ پھر سوچنے لگا۔

اگر یہ زخمی جوان بچایا نہیں گیا تو اس کی موت کا میں ذمہ دار بنوں گا۔ اگر میں اس کو اٹھا کر ہسپتال لیجاؤں گا۔ تو نزہت کے اندر کا زہر پھیل جائے گی اور اگر وہ مر گئی تو اس کی موت کا میں ہی ذمہ دار بنوں گا۔

اس نے ریورسگیر لگایا اپنی جگہ واپس آنے کے لئے لیکن وہ......، وہ نہ پیچھے آیا اور نہ آگے جا سکا۔

نزہت کی حالت اور اس کی جان کی فکر لیکر ماجد خان نے کار آگے دوڑادی البتہ سوچنے لگا یہ کون جوان تھا اور یہ میری کار کے نیچے آ کر مرنا یا زخمی ہونا کیوں چاہتا تھا۔ کہیں وہ میرا بیٹا تو نہیں تھا؟ ہاں! یہ وہی تو تھا۔ میں نے یہ کیا کیا، میں نے اس کو کار سے ٹکرا کر نیچے سڑک پر گرا کیوں دیا۔ وہ زخمی حالت میں تڑپ تڑپ کر مر رہا ہوگا مجھے اسے بچانا چاہے۔ مجھے اس کے پاس جا کر اسے گاڑی میں بٹھا کر ہسپتال لیجانا چاہے۔ اس کی مرہم پٹی کرانی چاہے، مگر......، اتنی دیر میں نزہت، میری نزہت اگر مر گئی۔ اگر وہ میرے آنے کا انتظار نہ کر سکی، اگر اتنی دیر میں اس نے جان دیدی......، لیکن میری اولاد......، او خدایا! میں کیا کروں کدھر جاؤں؟ بیٹے کو بچاؤں تو اس کی ماں مر جائے گی، اس کی ماں مر گئی تو میں کیا کروں، میں کدھر جاؤں۔ میرے بیٹے تم سڑک پر بڑے تڑپ رہے ہوں گے، میری نزہت تم میرے انتظار میں جان دے رہی ہوگی۔

ماجد نے کار کو بریک لگایا اور دونوں ہاتھوں میں لیکر سر کو زور سے دبایا اس کا

سر پھٹا جار ہا ہے۔کلیجہ مسوس رہا ہے۔ دل تڑپ رہا ہے، وہ کیا کرے کیا نہ کرے، کہاں جائے، کس کو مارے، کس کو بچائے،

وہ......وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو پیٹنے لگا۔'' البتہ اس کے تحت الشعور میں یہ بات آگئی کہ لڑکے کو کوئی بھی اٹھا کر بچا سکتا ہے پر میری نزہت، اس کو مجھے ہی بچانا پڑے گا! ماجد خان کار سٹارٹ کر کے دوڑ پڑا۔ کوئی ایک کلومیٹر کی مصافت طے کرتے ہی اسے خیال آیا۔

''میری کار کے ساتھ ٹکرانے والا اگر میرا بیٹا ساجد ہی تھا تو وہ ماں کی ہدایت پر میرے لئے قربانی دینے آیا ہوگا۔ وہ اپنے باپ کو ٹینشن سے نجات دلانے آیا ہوگا، اگر اس کا یہی فیصلہ تھا جس پر اس نے عمل کیا تو ماں کو ایسا کا جواب دیا جس پر وہ زہر کھانے کے لئے مجبور ہو گئی.....' ہو سکتا ہے اس نے ماں کو نا قابل برداشت جواب دینے کے بعد ارادہ بدل دیا ہو اور قربانی کا جذبہ لیکر سڑک پر میرا انتظار کر رہا ہو۔''

ماجد خان نے کار کو پھر بریک لگایا، وہ سوچنے لگا، مجھے واپس جا کر ساجد کو اٹھا لینا چاہے۔ اسے ہسپتال لیجانا چاہے۔ لیکن...... کیا میری نزہت اتنی دیر تک کا انتظار کر سکے گی۔ اف! میں کیا کروں، کدھر جاؤں، بیٹے کو بچانے جاؤں تو اس کی ماں مر جائے گیا۔ لیکن مجھے اپنے اندھے بیٹے کو بھی بچانا ہے۔ جو سڑک پر زخمی حالت میں پڑا ہے اور ماں کے کہنے پر میرے لئے قربانی دے رہا ہے۔ ماجد خان کے ذہن میں زبردست طلاطم پیدا ہوا، کیا وہ بیٹے کے پاس جا کر اسے اٹھا لے آئے گا، کیا وہ بیٹے کو سڑک پر پڑا رہنے دے گا اور اپنی بیوی کو بچانے کی

کوشش کرے گا؟ میں کہاں جاؤں؟ وہ کار سے نیچے اتر آیا اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ لیا، اور خود سے بولا، میری وجہ سے میری اولاد اور میری شریک حیات جان سے ہاتھ دھو رہے ہیں مجھے جینے کا کوئی حق نہیں، مجھے خودکشی کرنی چاہے۔ میں خودکشی کروں گا!

میں بیٹے ساجد کو بچانے کے لئے واپس جاؤں یا نزہت کو بچانے ڈاکٹر لے آنے جاؤں وہ اسی سوچ میں تھا کہ اس کے کانوں میں اس کی بیوی نزہت کی آواز آئی جو اسے اندر دوسرے کمرے سے بلا رہی ہے۔

وہ بڑی دلچسپی سے ناول پڑھ رہا تھا۔ نزہت کی بلاوے کی آواز پر اس نے ناول بند کر کے رکھدیا۔ جب وہ بیڈروم میں آیا تو نزہت نے اسے ڈاکٹر نیلو لانے کو کہا، ماجد خان جان گیا ان کی ڈیلوری کا وقت آ پہنچا ہے اور مجھے شادی کا پہلا ثمر ملنے والا ہے وہ بڑی پھرتی سے کمرے سے نکل گیا اور پھر کوٹھی سے نکل کر گیراج میں آیا۔ کار نکالی سڑک پر دوڑ لگائی۔

بلیوارڈ سڑک پر کار ہوا سے باتیں کرتے ہوئے جا رہی ہے۔ ماجد خان کے خیالات پرواز کرتے جا رہے ہیں۔ ان خیالات میں وہ اپنے اور نزہت کے درمیان شادی سے لیکر اب تک کی زندگی کو یاد کر کے کبھی شاد اور کبھی ناشاد ہو رہا ہے۔ اسے بار بار یہ خیال آ کر ستانے لگا عوت کے لئے یہ گھڑی بہت ہی نازک ہوتی ہے درد زہ کا دور بڑا ہی تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے......، انہی خیالات میں کار دوڑ کر ماجد خان جا رہا تھا کہ بلیوارڈ روڑ پر بوجھوارہ کے کراس روڑ پر اس کی کار ایکدم بریک لگانے سے چیخ پڑی، ماجد خان کار سے نیچے آیا تو

دیکھا ایک اندھا بھاری لڑکا اس کی کار کے نیچے آیا ہے۔ ماجد کان نے اسے کار کے ٹائر سے نکال کر ایک طرف رکھدیا اس نے دیکھا، اندھا بھکاری لڑکے دم توڑ چکا ہے۔ قبل اس کے کوئی اسے اندھا بھکاری لڑکا کا قتل کرنے پر پولیس کے سپرد کرلے وہ بڑی پھرتی سے کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ وہ اپنی بیوی نزہت کے لئے ریڈکراس سے ڈاکٹر نیلوفر لانے نکل پڑا۔

ٹھیک سولہ سال قبل جب وہ ڈاکٹر نیلوفر کو لاکر اپنے گھر کی طرف جارہا تھا اور اس جگہ پر پہنچ کر کار کو روک کر نیچے آیا تھا۔ ادھر ادھر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر یہاں سے چلدیا تھا تو ڈاکٹر نیلوفر نے پوچھا تھا آپ نے یہاں ایکدم کار کیوں روک دی، اور آپ کار سے نیچے آکر کیا دیکھ رہے تھے۔ ماجد خان نے لاش کا ذکر کر کے بتایا کوئی اسے اٹھا کر کہیں لے گیا ہے لیڈی ڈاکٹر نیلوفر کو گھر پہنچا کر وہ دوسرے کمرے میں ڈیلوری کے انتظار میں خوش خبری سننے کے انتظار میں تھے۔ کیونکہ لیڈی ڈاکٹر نے انہیں بتایا تھا میرا تجربہ کہتا ہے آپ کا پہلا بچہ لڑکی نہیں لڑکا ہوگا۔ کوئی بیس منٹ کے بعد جب لیڈی ڈاکٹر نیلوفر اندر سے باہر آئی تو ماجد خان ان کے سامنے کھڑا ہوا، ڈاکٹر نیلوفر نے بتایا۔

''میرا تجربہ کام آیا۔ اللہ تعلےٰ نے آپ کو بیٹا دیا ہے لیکن آپ کا بیٹا......

''کیا ہے، کیسا ہے؟'' اس نے بڑی بے صبری سے پوچھا''۔

ڈاکٹر نیلوفر بولی'' آپ کا بیٹا اندھا ہے......، پیدائشی اندھا!''

اس خبر سے ماجد خان حواس باختہ ہوا، اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی اور اس کے ساتھ آگے کو جھک کر اس نے اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹھکرایا۔ ایک

بار دور بار وہ دیوار کے ساتھ سر ٹکراتا رہا۔ ڈاکٹر نیلوفر نے اسے پکڑ کر ایسا کرنے سے روک دیا۔ ماجد خان ڈاکٹر نیلو سے مخاطب ہو کر گلوگیر آواز میں بولا۔ ''ڈاکٹر! میرا بیٹا اندھا نہیں تھا وہ اندھا ہو گیا ہے وہ ماں کی گود میں اسی وقت اندھا ہو گیا جب میں آپ کو لینے جا رہا تھا اور میری کار کے نیچے ایک اندھا بھکاری لڑکا آگیا''۔ ماجد خان دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگا اور خود سے کہنے لگا۔ میرا بیٹا میری غفلت کی وجہ سے اندھا ہو گیا مجھے اندھے بھکاری بچے کے قتل کی سزا مل گئی۔ میرے لیے یہ خطا عمر بھر کی سزا ہے۔ مجھے میرے بیٹے کا اندھاپن ہر وقت ہر گھڑی اندھے بھکاری لڑکے کی یادگار کے طور پر دی گئی ہے۔ میں عمر بھر کی اس سزا کے بجائے صرف ایکبار کی سزا قبول کروں گا میں پولیس کے سامنے خود کو پیش کروں گا۔ میں اندھے بھکاری لڑکے کو اپنی کار کے نیچے کچل کر مارنے کا قصور قبول کروں گا مگر...... میں نے، اسے نہیں مارا، میں نے اسے دیکھا نہیں۔ میں اپنے ہی خیالوں میں گم تھا وہ بوجھوارہ کی سڑک پر کراسنک سے ایکدم باہر آیا میری اسمیں کوئی خطا نہیں کوئی قصور نہیں، پھر...... قدرت نے مجھے یہ سزا کیوں دی اس سزا کی عمر بھر کے لئے یادگار کیوں دی، میں کیا کروں، کدھر جاؤں، نزہت کو جب پتہ چلے گا اس نے اندھے بچے کو جنم دیا ہے وہ بھی کیسے برداشت کرے گی، اور جب وہ حقیقت جان لے گی تو مجھے ہی اس کا خطاکار مانے گی۔

ماجد خان کے دل دماغ پر یہ بات بیٹھ گئی اس کی گاڑی کے نیچے اندھے بھکاری لڑکے کی موت، قدرت کی طرف سے سزا کے طور پر ان کا نوزائد اندھا بنکر آیا ہے۔

اندھا بھکاری بچے کی یادگار کو اپنے گھر میں پال کر ماجد خان اس ذہنی عذاب کے ساتھ روحانی عذاب سے نجات نہ پاسکا۔ چونکہ اپنے گھر اور دفتر جانے کے لئے اسے ڈلگیٹ کا راستہ اختیار کرنا پڑ رہا ہے۔ تو آتے جاتے اس جگہ پر جہاں اندھا بھکاری لڑکا اس کی کار کے نیچے آکر اپنی جان دے گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر ماجد خان کی کار ضرور رک جاتی ہے چوکسی برتنے اور پختہ ارادہ کرنے کے باوجود کار یہاں رک جاتی ہے۔ ماجد خان لاش کی تلاش کرنے لگتا اور پھر خود کو کوسنے لگتا۔ اس سڑک پر حادثہ کی یادگار تو اس نے پیچھے چھوڑ دی البتہ اس نے ماجد خان کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑا وقت گزرتا گیا۔ دن ہفتوں میں ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدل گئے۔ ماجد خان کا بیٹا ساجد خان بھی بڑھتا گیا۔ پیدائشی اندھا ہونے کے ناطے اس کے ٹھیک ہونے کا کوئی چانس نہ تھا باپ اپنے بیٹے کا اندھاپن اپنی خطا اور قصور کے ساتھ جوڑ کر زندگی گزارتا رہا گاڑی چلاتا رہا۔ گھر میں اندھے نوزائد کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی ماضی کی خطا ایک روگ بن گئی۔ اپنی مخصوص جگہ پہنچکر ماجد خان کو لگتا، اس کی کار کے نیچے جوا ندھا بھکاری لڑکا آیا وہ اب بھی یہیں پر موجود ہے اور ان سے جان بچانے کی التجا کر رہا ہے یہ التجا اس کے لئے ذہنی اور روحانی عذاب بن رہی ہے۔

ماجد خان نے ان ہفتوں، مہینوں اور سالوں میں ان گنت بار اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا وہ بلیوارڈ روڈ پر چل کر بوچھوارہ کراسنگ پر کار کو نہیں روکے گا۔ لاش کی تلاش نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود بھی غیر ارادی طور پر کار یہاں رک جاتی، اور وہ خود کو کوس کر چلا جاتا۔ کوٹھی پر آکر وہ اس ذہنی الجھن سے نجات پانے

کے لئے ،اپنی بیوی کے ساتھ اپنے ساتھیوں یار دوستوں کی نصیحت اور ان کی رائے پر عمل کرنے کا عہد ضرور کرتا مگر ساجد خان کے بڑنے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کا روگ بھی بڑھتا گیا۔

اس کے اندر کے اس روگ سے اس کی صحت پر اثر پڑ گیا۔ وہ دل کا مریض بن گیا۔ ہر وقت مغموم اور پریشان رہنے سے اس کی دماغی قوت سلب ہونے لگی ،وقت بے وقت اس کو دورے پڑنے لگے۔ اپنے شوہر کی حالت اور اس کے بگڑتے صحت کو دیکھکر نزہت بہت دلگیر ہوگئی۔ ایک طرف لخت جگر کا اندھا پن دوسری طرف ماجد خان کی حال نے اسے اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ عورت کے پاس چونکہ غم غلط کرنے کا واحد ذریعہ رونا اور آنسو بہانہ ہے سو وہ اکثر گھر میں روتی رہی ،آنسو بہتاتی رہی اس سے اس کی آنکھوں کی بینائی متاثر ہوگئی۔ میاں بیوی اس حد تک صحت سے گر گئے کہ ان کی اور کوئی اولاد نہ ہوسکی۔ زندگی کا یہ حادثہ جو برسوں پہلے وقوع پزیر ہوا، اپنی اور اپنی بیوی نزہت کے ساتھ گھر کی بگڑتی حالت کو دیکھکر ماجد خان نے کتنی بات اس حادثہ کو بھول جانے کا عہد کیا لیکن وہ اس عہد پر قایم نہ رہ سکا۔ اس ذہنی الجھن سے نجات پانے کے لئے ماجد خان نے کتنے ڈاکٹری مشورہ لئے کتنے حکیموں کے نسخے آزمائے اور تو اور پیروں اور فقیروں سے بھی رجوع کیا، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوسکا۔ اپنے اور پرائیوں کی ہدایات پر عمل کر کے مہینوں گھر سے دور صحت افزامات کی سیر کی، مہینوں پہلگام اور گلمر گ میں قیام کیا۔ البتہ گھر واپس آ کر پھر وہی الجھن، پھر وہی پریشانی پھر وہی معمول کی زندگی پھر وہی گاڑی وہی راستہ اور پھر وہی یادیں۔ ساجد خان جب سولہ سال

میں قیام کیا۔ البتہ گھر واپس آ کر پھر وہی الجھن، پھر وہی پریشانی پھر وہی معمول کی زندگی پھر وہی گاڑی وہی راستہ اور پھر وہی یادیں۔ ساجد خان جب سولہ سال کا ہو گیا، یعنی حادثہ کی یادگار سولہ سال کی ہوگئی ماجد خان جسمانی طور کافی لاغر ہونے کے ساتھ ذہنی طور بھی مفلوج سا ہو گیا۔ انہیں ذہنی طور مریضوں کے ہسپتال لیا گیا۔ یہاں ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم نے ان کا ملاحظ کیا اس کی ہسٹری نوٹ کر لی تو بورڈ میٹنگ میں یہ متفقہ رائے سامنے آ گئی، ماجد خان کو مالیخولیا ہو گیا ہے اور جب تک کوئی لڑکا اس کی کار کے ساتھ ٹکرایا نہیں جاتا ہے اور وہ اسلرڈ کے کو اٹھا کر اس کا اعلاج نہیں کرائے گا۔ ان کا واپس اپنی اصلی زندگی میں آنا بہت مشکل اور ناممکن بھی ہے۔ ڈاکٹری بورڈ کے اس متفقہ فیصلہ یا تجویز پر کیسے عمل ہوگا۔ کون لڑکا اس کی کار کی زد میں آنے اور خود کو زخمی کرنے کے لئے تیار ہوگا۔ جس کو ماجد خان اٹھا کر ہسپتال لے جا سکے اس کی جان بچا سکے اور اپنے اندر کے مالیخولیا سے نجات پا سکے۔

اس پر کافی غور و خوض کے بعد دل پر بڑا وزنی پتھر رکھکر ماں نے اپنے بیٹے کو اپنے باپ کے لئے یہ قربانی دینیکی آفر دی، اس کے ساتھ نزہت نے اپنے شوہر کی حالت اور اندھے بیٹے کے زخمی ہونے یا ان کی جان چلی جانے کا خدشہ کو مدنظر رکھکر زہر کھانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ جب اس نے زہر لا کر کھا لیا تو خلاف توقع اس کے بیٹے نے قربانی دینے سے انکار کرتے ہوئے بتایا، اگر میں اندھا یعنی بیکار نہیں ہوتا تو کیا ایک ماں ہو کر تم مجھ سے ایسا خطرناک قدم اٹھانے کے لئے کہہ سکتی۔ اس جواب سے ماں کے دل کو ایک زبردست ٹھیس پہنچ گئی۔ وہ بیٹے

کی کوشش کرنے لگی ،اس نے ماجد خان کو بلایا اور بتایا اس نے زہر کھالیا ہے، مرنے کے لئے ،لیکن وہ اب مرنا نہیں چاہتی ہے۔تم جا کر جلدی سے کوئی ڈاکٹر لے آؤ، وہ میرا اسٹامک واش کرے گا۔

حالات اور وقت کی نزاکت دیکھکر ماجد نزہت سے تفصیل جاننے کے بجائے فوری طور پر یہاں سے نکل پڑا، کار گیراج سے نکالی اور سڑک پر دوڑ پڑا، ادھر ساجد کو جب احساس ہوا ان کی ماں نے ان کی قربانی کو لیکر اپنی زندگی کی قربانی دینے کے لئے زہر کھالیا ہے تو وہ گھر سے نکل کر بیلوارڈ کی سڑک پر والد کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔اندھا ہو کر بھی وہ کسی اور کی کار کے بجائے صرف اپنے والد کی کار سے ٹکرایا، کیونکہ اندھوں کے پاس جان پہچان کی ایک الگ روشنی ہوتی ہے۔

بیلوارڈ روڑ پر کار ایکبار اور ایک جھٹکے سے رک گئی،قبل اس کے کہ ماجد خان کار سے نیچے اتر آتا،نزہت اور ساجد نے ایک ساتھ اسے ٹوکا جو کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ماجد خان شرمندگی سے بولا'' آج آخری بار یہاں رکا ہوں، وہ بھی غیر ارادی طور پر......اب ایسا کبھی نہیں ہوگا۔کیونکہ ہم نے گگری بل میں اپنی کوٹھی بیچ ڈالی اور اب حیدر پورہ میں بود باش کرنے جا رہے ہیں۔اب یہ راستہ ہمیشہ کے لئے ہم چھوڑ رہے ہیں۔اور اس علاقہ کو خیر باد کہہ رہے ہیں۔

کار اسٹارٹ ہو کر جلدی......ماجد خان نے ایک لمبی سانس لیکر انگڑائی لی وہ اپنی کوٹھی کے ریڈنگ روم میں بیٹھ کر اس ناول کو ختم کر کے گویا اطمینان کا سانس لے رہا ہے۔جوان کے قریبی دوست اور ساتھی شوقین کشمیری نے ''یادگار'' کے نام سے ان کی زندگی کے پس منظر میں لکھکر شائع کی تھی۔

⌘⌘⌘

پانی کا دھواں

رات کے تاریک اور مہیب سناٹے میں جسپال کو ایک بھیانک چیخ سنائی دی گھری نیند میں ہونے کے سبب وہ اس چیخ پر صرف کروٹ بدل سکا۔ البتہ جب اس کے ساتھ اس کی کانوں میں رونے کی آوازیں آئیں تو انہوں نے ایک اور کروٹ بدلی البتہ دوسرے لمحے وہ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملنے لگا۔ اس کی کانوں میں چیخنے چلانے کی ساتھ رونے کی آوازیں اب بھی آرہی ہیں۔ اس نے دائیاں بازو بستر سے نکال کر بیڈ سوئچ تلاش کیا۔ ادھر ادھر ہاتھ پھیر کر جب اس کے ہاتھ میں بیڈ سوئچ آ گیا اور اس نے بٹن دبا کر لائٹ آن کی تو سر اٹھا کر دیکھا اس کی بیوی ننگ دھڑنگ کمرے میں دیوار کے ساتھ نہ صرف سر پھوڑ رہی ہے بلکہ زور زور سے رو رہی ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک طرح سے اپنے چہرے کو نوچ رہی ہے۔ جسپال نے اپنی بیوی کو اس طرح اس حال میں خود کو روتے پیٹتے اور دیوار کے ساتھ سر پھوڑتے دیکھا تو اس پر گویا سکتہ طاری ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہے۔ وہ ایک جست لگا کر بیڈ سے نیچے آیا، وہ لتیکا کے پاس آیا اسے اپنی بانہوں میں لیا۔

"کیا بات ہے، میری جان، تم یہاں، اس حالت میں، یہ کیا ہے؟"

لتیکا نے اپنے شوہر جسپال کی طرف بھیگی نظروں سے دیکھا۔ کچھ کہتے کہتے رگ گئی جسپال نے اسے اپنی بانہوں میں کس لیا اور گھمبیر لہجے سے پوچھا۔

"تم یہاں کیسے آ گئی، کیوں آ گئی، تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے بتاؤں نا، دیکھو میری جان نکلتی جا رہی ہے۔ مجھ سے یہ سار کچھ دیکھا نہیں جاتا"۔

لتیکا دنوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھر رونے لگی۔

"لتیکا، یہ تم کیا کر رہی ہو، تم رو کیوں رہی ہو، مجھے بتاؤ بات کیا ہے تم اس طرح رو رہی ہو، خود کو کوس رہی ہو، آخر ماجرا کیا ہے؟ مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی ہے"۔

"میرے جسپال! تم اٹھ کر سو جاؤ، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"!

"کیا کہہ رہی ہو، تم کو اس حال میں چھوڑوں اور خود اٹھ کر سو جاؤں۔ دیکھ نہیں رہی ہو، تمہاری یہ حالت دیکھ کر مجھے کیا ہو رہا ہے، میرا تو جگر کترا جا رہا ہے سر پھٹا جا رہا ہے، اگر تم مجھے جلدی جلدی ماجرا نہیں بتاؤ گی، تو تم مجھے زندہ......

کلپنا نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ جسپال نے اپنے منہ پر سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا اور وہ ادھر ادھر دیکھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ دروازہ اندر سے بند ہے کھڑکیوں پر پردے لٹکے ہیں۔ سارا کچھ ٹھیک ہے پھر اس کی لتیکا اس وقت اس حالت میں......

"جس......پا......ل"! لتیکا گلوگیر آواز میں بس اتنا بول سکی"۔

"ہاں......ہاں! بتاؤ، میری جان بتاؤ، کیا بات ہے"؟

"میرے جسپال، مجھے یہ کیا ہو گیا؟

''کیا ہوا، یہی تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ دیکھو مجھے زیادہ نہ تڑپاؤ۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے''۔

''میری نیت میں فتور کیوں آ گیا''

''نیت میں فتور، کیا کہہ رہی ہو تم، مجھے صاف صاف بتاؤ، بات کیا ہے؟''

''میں بدل کیوں گئی''؟

''کون کہہ رہا ہے تم بدل گئی ہو''؟

''میرا من کہہ رہا ہے، میں بدل گئی ہوں، میری نیت بدل گئی ہے؟''

''کلپنا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو، بھگوان کے لئے مجھے ایسی خبر نہ سنانا، جس کے سننے کی میں تاب نہ لا سکوں، اور خود کو زندہ رہنے کے قابل نہ سمجھوں''

''تم زندہ رہو گے، میرے جسپال! تم میرے لئے میرے بچے کے لئے زندہ رہو گے''

''دیکھو، پہلے مجھے ماجرا بتاؤ، یہ بدل جانا، یہ فتور آنا، معاملہ کیا ہے؟ اس سے پہلے کہ تم مجھے کوئی روح فرسا خبر سناؤ گی تم مجھے بتاؤ اس معاملے میں تم بے قصور ہو کہ نہیں؟''

''میں تمہاری قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں۔ اسمیں میرا کوئی قصور نہیں''۔

''پھر کس کا قصور ہے''

''میں اس کو نہیں جانتی''!

''کیا یہاں کوئی آیا تھا''؟

''نہیں یہاں کوئی نہیں آیا، میں ہی اس کے پاس گئی''۔

جسپال دھک سے رہ گیا، دوسرے لمحے چلاتے ہوئے بولا، ''کلپنا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو تم کس کے پاس گئی تھی، کہاں گئی تھی کیا کرنے گئی تھی، کلپنا! تم دیکھو میرا صبر زخمی ہو رہا ہے۔ میرے برداشت پر چھریاں برس رہی ہیں، تم ہو کہ میرا امتحان لے رہی ہو؟

''میں سچ کہہ رہی ہوں، قصور میرا اپنا ہے۔''

''قصور تمہارا اپنا ہے اور میں...... میں تم کو......اس سے پہلے کہ میرے ہاتھ تمہارے گلے تک اٹھ جائیں، تم کہدو میں اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہوں''۔

''جسپال، تم بے شک میرا گلا گھونٹ دو''

''کلپنا! ادھر دیکھو، میرے یہ ہاتھ تمہارے گلے تک اٹھنے کے لئے مچل رہے ہیں تا کہ تمہارے منہ سے وہ بات نکل نہ سکے جس کے سننے کے لئے میں تیار نہیں''۔

''لیکن میں سنائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں، میرے اندر کوئی بے وفائی نہیں، اگر ایسی بات ہوتی تو میں بستر سے نکل کر خود کو سزا نہیں دیتی، خود کو قصوروار جان کر دیوار کے ساتھ سر کو نہیں پھوڑتی، میں اپنے کئے پر گریہ زاری سے نہیں روتی، میری یہ حالت میرا پچھتاوا ہے''۔

''لیکن کس بات کا پچھتاوا، یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں''۔

''میں تم کو اور اپنے بچے کو چھوڑ کر یہاں سے چلی گئی''۔

''کہاں ......، کہاں چلی گئی؟''

''میں ......، ممبئی چلی گئی''۔

''کب ......؟''

''ابھی ابھی کچھ دیر پہلے ......، سپنے میں!''

''کیا تم یہ سب سپنے کی باتیں کہہ رہی ہو؟''

''جسپال ......! میں نے ایک برا سپنا دیکھا''۔

''کیا تم سپنے میں ہی بیڈ سے اتر کر یہاں چیخنے چلانے لگی تھی''۔

''ہاں! میں بھاگنے بھی لگی تھی، خود کو چھڑا کر اور وہاں سے بھاگ کر میں تمہارے اور تمہارے بچے کے پاس آرہی تھی کہ دیوار کے ساتھ ٹکرا گئی، میرے منہ سے بھیانک چیخ نکل گئی''۔

''سپنے میں ......، تم نے کیا دیکھا؟''

''وہی تو بتا رہی ہوں، کل دن کو جب ہم سینما میں فلم دیکھکر گھر آرہے تھے تو''

''مگر وہ تو حقیقت ہے، سپنا نہیں''۔

''حقیقت کے بعد میں سپنے پر آؤں گی، تم کو یاد ہے جب فلم دیکھکر ہم باہر آئے تو میں نے فلم کی ہیروئن کی ایکٹنگ پر اعتراض اٹھایا تھا، ایکٹنگ کے بارے میں وہ بالکل اناڑی تھی۔ یہ بات میں نے تمہیں بتائی تھی''۔

''کلپنا! میں جانتا ہوں اور دیکھ رہا ہوں، تمہیں فلمیں دیکھنے کا جتنا زیادہ شوق ہے اتنا ہی فلموں میں کام کرنے کی بھی چاہت ہے''۔

''دراصل کالج کے دور میں، میں نے بہت سارے اسٹیج ڈراموں میں کام

کیا اور دو ایک ڈی وی ڈراموں میں بہترین رول ادا کیئے ہیں، فلموں میں کام کرنے کا مجھے شوق ضرور ہے البتہ فلمی ماحول سے میں دور بھاگتی ہوں۔ یہاں شہرت اور دولت ضرور ملتی ہے مگر......

''ایسا تو میں نے کئی بار آپ کی زبان سے سنا ہے، لیکن آج کیا ہوا، یہی میں جاننا چاہتا ہوں''۔

''آج دن کو ہم نے جو فلم دیکھی اس کا میں نے بڑا گہرا اثر لیا۔ اسی اثر کو لیکر کھانا کھانے کے بعد اور معمول کے کام کرنے کے بعد ہم سو گئے''۔

''پھر کیا ہوا......؟''

''میرے دماغ میں فتور آ گیا مجھ پر فلم ایکٹر بننے کا جنون سوار ہوا، تم کو اپنے بچے کو چھوڑ کر یہاں تک کہ اپنے گھر سے نقدی اور زیورات لے کر ممبئی بھاگ آئی ،ایک فلم پرڈیوسر نے مجھے اپنا لیا، فلم میں ہیروئن بننے کا چانس دینے کا وعدہ دیا ۔اس نے مجھے خوب پلایا پھر اپنے پاس سلا دیا۔ اور جب اس نے......، میں نے اسے ایک جھٹکا دیا، اس کی گرفت سے خود کو چھڑایا۔ میں اپنی اس حرکت پر سخت نادم ہو کر پچھتائی مجھے اپنی اس حرکت پر گھن آئی میں نے خود کو قصوروار جان کر اس کی سزا دینے کا ارادہ کر لیا میں وہاں سے بھاگ آئی دوڑتے بھاگتے میں دیوار کے ساتھ ٹکرائی میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''کلپنا! یہ سارا معاملہ ایک سپنے کا ہے لہٰذا اس کی کوئی اہمیت نہیں''۔

''لیکن سپنے میں ہی سہی، میں اس قدر اپنے اخلاق سے اپنے کردار سے گر کیوں گئی میں نے تم کو اور تمہارے بچے کو کیوں چھوڑا، اور فلمی ہیروئن بننے ممبئی

کیوں چلی گئی؟ مجھے ایسا کرنا نہیں چاہے تھا مجھے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہے تھا۔

یہ کوئی معمولی قصور نہیں، اس کی تمہیں مجھے سخت سے سخت سزا دینا پڑے گی۔

''سپنوں پر سزا اور جزا کا معاملہ اتنا سنگین نہیں جتنا تم سمجھتی ہو، سپنوں میں انسان کیا کیا نہیں دیکھتا اگر میں تمہیں کبھی کبھار دیکھے جانے والے سپنوں کے بارے میں بتاؤں تو ہم سب سپنے ہی بن جائیں گے، میری مانو! تم سپنے کی دنیا کو چھوڑ کر اٹھو، اور آؤ ہم دونوں بیڈ پر آ کر انجوائے کرتے ہیں۔ جسپال نے لتیکا کو اپنے دونوں بانہوں میں اٹھالیا اور بیڈ پر لٹا دیا اس کے بعد جسپال نے لتیکا کو سپنے کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں واپس لایا۔ اسے فلمی دنیا سے واپس گھر لایا۔ سپنے میں غلط کرنے کر کلپنا کے پچھتاوے پر اطمینان کا اظہار کر کے جسپال نے کلپنا کو اس کی بیوی ہونے کا احساس دلایا، اس کے ساتھ انجوائے کر کے اسے سارا کچھ بھول جانے کا درس دیا۔ کلپنا نے بھی سپنے میں ہی سہی غلط قدم اٹھانے پر خود کو سزا وار جان کر جسپال کا دل جیت لیا۔

پورا ایک سال بیت گیا۔ جسپال کلپنا کی گمشدگی کا F.I.R. درج کرانے کے لئے پولیس اسٹیشن گیا تو ان سے انسپکٹر نے پوچھ لیا۔

''کیا آپ کو پورا یقین ہے، آپ کی بیوی کلپنا لاپتہ ہوگئی ہے''۔

''کیا مطلب......؟''

''میرا مطلب ہے کہیں وہ خود کسی کے ساتھ بھاگ تو نہیں گئی؟ آپ کو کسی پر اس کو اغوا کر کے لیجانے کا شبہ تو نہیں!''

''انسپکٹر صاحب! ایسی عورت کسی کے ساتھ بھاگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اغوا کا معاملہ خارج نہیں کیا جا سکتا کرنے، میرا خیال ہے آپ نے اس کے بارے میں غلط رائے قائم کی ہے''۔

''آپ برا نہ مانیں، ہم نے ویسے ہی پوچھا، کیونکہ ایسے واقعات اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں۔'' شوہر کو چھوڑ کر یار کے ساتھ بھاگنے کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔

''اگر مجھے اس بات کا ذرہ بھی گمان ہوتا وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو میں اس کا کھو جانا اپنے لئے نیک فعال سمجھتا، وہ ایک مثالی عورت ہے، جس کی پوجا کی جائے وہ بھی کم ہے۔ وہ مجھے اپنی زندگی سمجھتی ہے میں بھی اسے اپنی جان سے عزیز رکھتا ہوں''۔

''اس کا مطلب ہے آپ دونوں کی زندگی بڑی خوشگوار گزرتی تھی''۔

''انسپکٹر صاحب! خوشگوار اور مثالی بھی!''

''ایسی بات ہے تو وہ اپنے گھر سے نقدی، زیورات اور اپنے کپڑے ساتھ کیوں لے گئی؟''

''لیکن وہ گھر سے غائب نہیں ہوئی!''

''پھر کہاں سے......؟''

''ہم دونوں سینما میں فلم دیکھ رہے تھے۔ ہاف ٹائم سے کچھ دیر بعد اس نے میری گود میں بچہ رکھا، اور وہ اٹھ کر باہر چلدی، میں نے اندازہ کر لیا، یہ یورنیل گئی ہے البتہ فلم کا شو ختم ہونے تک جب وہ واپس نہیں آئی تو میں بچے کو لیکر گھر آ گیا

یہاں میں نے دیکھا نقدی زیورات اور ان کے کپڑوں کی اٹیچی نہیں ہے، میں رات بھر انتظار کرتا رہا، تمام ممکنہ جگہوں سے معلومات حاصل کرتا رہا، کچھ حاصل نہ ہوا، آج کی گمشدگی کا تیسرا روز ہے کہیں کوئی پتہ نہیں چلتا"۔

انسپکٹر بولا" ہم نے آپ کی درخواست لے لی ہے، ہم بھی تلاش کرتے ہیں ،آپ کو بھی کوئی اطلاع مل گئی تو ہمیں بتا دینا، اب آپ جایئے"۔

چار روز کے بعد انسپکٹر جسپال کے گھر آیا، اور انہوں نے جسپال کو بتایا آپ کی بیوی کا پتہ مل گیا ہے وہ ممبئ میں ایک فلم کے پرڈیوسر کے ہاں پائی گئی ہے اور پولیس کی نگرانی میں رکھی گئی ہے۔ ساری صورت حال کا پتہ آپ کو وہاں جا کر پتہ چلے گا پولیس انسپکٹر سے اطلاع پا کر جسپال کی گویا خوشیوں سے باچھیں کھل گئیں ۔اس نے اپنے بیٹے کو گود میں لیکر اسکے دونوں گال خوب چومے اور اسے ماں کے مل جانے کی خوشی کی خبر سنا دی، جسپال اسی وقت ممبئ جانے کی تیاری میں جٹ گئے ۔انہوں نے پہلی فرصت میں ممبئ کی ائر ٹکٹ لے لی۔ اور اگلی صبح کو وہ اپنے دو سال کے بیٹے کو لیکر ایر پورٹ پہنچ گئے ۔دن کے اڑھائی بجے جسپال ممبئ میں تھے اور ایک ٹکسی کے ذریعے دارد پولیس اسٹیشن پہنچ گئے ۔دادر پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او، سے اپنا تعارف کرانے کے بعد انہوں نے لتیکا کے بارے میں دریافت کیا تو ان سے کہا گیا۔

"آپ اپنی بیوی سے ملنے اکیلے بھی آسکتے، بچے کو ساتھ کیوں لائے ۔انہوں نے بتایا۔" میں اپنی بیوی کے لئے جتنا تڑپ رہا ہوں اس سے کہیں زیادہ یہ بچہ اپنی ماں کے لئے ترس رہا ہے۔ بھگوان کے لئے ہمیں جلدی جلدی کلپنا سے

ملنے دیجئے''۔

''گھبرانے کی بات نہیں، آپ کی بیوی، آپ کو مل جائے گی!''

''وہ اس وقت کہاں ہے؟'' جسپال کی آواز میں تذب تھا۔

''ہم آپ کو سب بتادیں گے۔ ہم آپ کو ان کے پاس لیجائیں گے، پہلے آپ سے یہ جاننا چاہیں گے، آپ کی بیوی کا چال چلن کیسا ہے۔ کیا آپ کو اس کے کریکٹر پر کوئی شبہہ ہے''؟

''بھگوان کیلئے ایسی بات زبان پر نہ لائے، اس سے پہلے کہ میں اس کے چال چلن پر ذرا سا بھی شک کا اظہار کروں، مجھ پر لعنت ہے۔ وہ ایک وفادار اور شرمدار عورت ہے۔ اس کی جدائی پر میری حالت آپ دکھ رہے ہیں۔ حالانکہ میری جدائی میں اس کی حالت مجھ سے زیادہ ابتر ہوگی، وہ میرے اور اپنے بیٹے کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہوگی۔

''میں آپ کے احساسات اور جذبات کی قدر کرتا ہوں، البتہ ہمارے مشاہدے میں ایسے کیس آتے ہیں اور ہمیں دوسرے اینگل سے بھی معاملہ دیکھنا پڑتا ہے''۔

''کیا آپ نے اس کو گرفتار کرلیا ہے''۔ جسپال نے عاجزی سے پوچھا۔

''کس کو، کس کی گرفتاری کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔

''جس نے میرے بیوی کو اغوا کر کے سرینگر سے یہاں لایا ہے''۔

''لیکن یہ اغوا کا کیس نہیں ہے، آپ کی بیوی یہاں ممبئ آ گئی ہے، فلموں میں کام کرنے کی غرض سے وہ فلم پرڈیوسر رام پال کے ہاں مقیم ہے''۔

''آپ غلط کہہ رہے ہیں'' جسپال رندھے ہوئے گلے سے بولا۔

پولیس آفیسر نے کہا ''اگر ہم غلط کہہ رہے ہیں تو چلئے، آیئے ہمارے ساتھ!''

''کہاں چلنا ہے''۔

''ہم آپ کو آپ کی بیوی سے ملاتے ہیں''۔

پولیس آفیسر کے ساتھ جسپال کھڑا ہوا اور پھر دونوں باہر آیئے، پولیس آفیسر نے اپنے ساتھ دو سپاہی بھی ساتھ لئے اور پولیس گاڑی میں جسپال اور اس کے بیٹے کو اپنے ساتھ لے گئے۔ کافی مضافت طے کرنے کے بعد جب گاڑی پر ڈیو سر رام پال کی کوٹھی کے پاس رک گئی تو رام پال سے ملنے کی اطلاع اندر بھیج دی گئی۔ پولیس آفیسر اور جسپال کو اندر بلا کر مہمان خانے میں بیٹھا دیا گیا، تھوڑی دیر بعد رام پال اندر آیا اور دونوں کے ساتھ شیک ہینڈ کر کے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

پولیس آفیسر رام پال سے مخاطب ہوا۔

''یہ مسٹر جسپال ہیں، سرینگر سے اپنی بیوی سے ملنے آئے ہیں''۔

''بیشک مل سکتے ہیں، اور اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں''۔

''ان کا الزام ہے، آپ نے ان کی مسز کو اغوا کر کے لایا ہے''۔

رام پال نے اس الزام کو ہنسی میں ٹال دیا۔ اتنے میں لتیکا اندر آئی اور آتے ہی بولی۔

''ادھر یہ سب کیا ہو رہا ہے''۔

رام پال نے اس سے مخاطب ہو کر بتایا، کیا تم نے سنا نہیں، یہ تمہارا شوہر

ہے اور اس کی گود میں تمہارا بچہ ہے، اور دیکھو، بچہ رونے لگا ہے،

''میرا کوئی شوہر نہیں، کوئی بچہ نہیں''۔

''کلپنا'' جسپال چیخ پڑا۔

کلپنا نے رام پال سے مخاطب ہر کر بتایا'' آپ یہاں کیا قصہ لیکر بیٹھ گئے ہیں، ہمیں شوٹنگ پر جانا ہے، دیر ہو رہی ہے''۔

رام پال کھڑا ہوا، لتیکا اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلتی بنی۔ جسپال ہکا بکا ہو کر دونوں کو باہر جاتے دیکھتا رہا، بچہ اس کی گود میں روتا رہا۔



گواہی کے تھپیڑے

عدالت کی کاروائی شروع ہوتے ہی جب سب سے پہلے گواہوں کو پیش ہونے کے لئے بلایا گیا۔تو کچھ دیر تک بطور گواہ کوئی کٹہرے پر کھڑا نہیں ہوا، بار بار پکارنے کے باوجود جب گواہ حاضر نہ ہوئے تو پولیس انسپکٹر کٹہرے میں آئے اور مجسٹریٹ سے مخاطب ہوکر بولے۔

''مے لارڈ! اس کیس کے گواہ حاضر عدالت نہیں ہوسکتے، وہ گواہی بھی نہیں دے سکتے''۔

مجسٹریٹ نے پوچھا'' کیوں؟ گواہ حاضر کیوں نہیں ہوسکتے، وہ گواہی کیوں نہیں دے سکتے''۔

''مے لارڈ! اس قتل کے کیس کا گواہ ایک روتا ہوا معصوم شیر خوار بچہ ہے اور دوسرا گواہ برستی ہوئی بارش ہے۔ظاہر ہے نہ شیر خوار بچہ گواہی دے سکتا ہے اور نہ بارش کو حاضر عدالت کیا جاسکتا ہے''۔

''معصوم شیر خوار بچہ کا رونا اور بارش کا برسنا، ان کو کس نے گواہ رکھا ہے''

''مقتولہ نے!''

''عدالت کے لئے وہ گواہ قابل قبول نہیں ہو سکتے ، جو خود گواہی دینے کی پوزیشن میں نہ ہوں۔ لہٰذا اس کیس کو نئے سر سے ترتیب دیا جائے ،عدالت ملتوی ہوتی ہے''۔

راشد میر بیڈروم میں مغموم بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا، انہیں اس کمرے کے در دیوار گویا کاٹ کھانے کو آرہے تھے۔ کمرے کی ایک ایک چیز اس کا فرش پردے ڈریسنگ ٹیبل اور دیواروں پر لگے آرٹ کے نمونے جو اس کی بیوی نسرین نے لاکر سجا رکھے تھے یہ سب چیزیں گویا سانپ بنکر انہیں ڈس رہی تھیں۔ وہ خود کو اپنے کئے قصور پر ضرور کوس رہا تھا البتہ سوچ رہا تھا۔ میں کیا کروں، مجھ سے معصوم بچے کا رونا برداشت نہیں ہوتا خاص طور پر اس وقت جب باہر بارش ہو رہی ہو، میں خود کو سمجھاتا ہوں پر کیا کروں، کون میری مجبوری سمجھے اور میں کس کو حال دل بتاؤں'' راشد اسی سوچ اور ادھیڑ بن میں تھا کہ ان کا نوکر سلطان اندر آیا اور بڑی انکساری سے بولا'' مالک! ہم جاتا ہے برسوں تک اس گھر کا نمک کھایا ہے اسلئے اگر کبھی ہم سے کوئی خطا ہوا ہم کو معاف کرنا''

''سلطان! کیا تم بھی ہم کو چھوڑ کر جا رہے ہو، یہ جان کر کہ میں بالکل اکیلا ہوں''

''مالک! آپ ہی تو ہم کو نکال رہا ہے آپ نے تو ہم سے کہا چلے جاؤ میرے گھر سے، دفعہ ہو جاؤ میری نجروں سے......''

''مجھے یاد نہیں۔ میں نے کب کیا کہا، اگر یہی کہا ہے تو غصہ میں کہا ہوگا تم تو بخوبی جانتے ہو، آجکل میں کن حالات سے گزر رہا ہوں؟

''مالک! آپ برا مانے گا نہیں ،آپ حالات کو خود خراب کرتا ہے''۔

''ہر کوئی حالات خراب کرنے ، حالات بگاڑنے کا الزام مجھ پر ہی لگاتا ہے تم بھی لگاؤ، کیا فرق پڑے گا!''

''مالک! میں الزام نہیں لگاتا ، میرا کیا حیثیت ہے جو میں اپنے مالک پر الزام لگائے گا ،ہم نے آپ کو سمجھایا تھا کہ آپ جو یہ کرتا ہے ہیں ٹھیک نہیں ہے ! کون ایسا ماں ہوگا جو اپنے بچے کو رلائے گا ،اور جب وہ روتا ہے تو چپ نہیں کرائے گا!''

''وہ تو ٹھیک ہے پر میں اس کو اور تم کو کیسے سمجھاؤں، معصوم بچے کا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، اگر میں نے اپنی بیوی کو سمجھا دیا اور بار بار بتا دیا میرے سامنے معصوم بچہ رونا نہیں چاہے تو وہ سمجھتی کیوں نہیں''۔

''مالک وہ سمجھتا ہے مگر معصوم بچہ کسی کی ہدایت پر نہ روتا ہے اور نہ ہی چپ کرتا ہیہم نے سنا ہے بچوں کا رونا ان کی ورزش ہوتا ہے''۔

''میں یہ فلسفہ جانتا ہوں، اور یہ بھی جانتا ہوں بچوں کا رونا ان کی صحت کے لئے ضروری ہے پر میں کیا کروں، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا!''

''مالک! یہی آپ کا مجبوری ہے اگر آپ برداشت کرتا تو آج یہ نوبت نہیں آتا مالکن تیسری اور آخری بار اس گھر کو چھوڑ کر چلی گیا !''

''آخری بار کا کیا مطلب؟''

''مالک! اب وہ دوبارہ اس گھر میں واپس نہیں آئے گا، وہ ہم کو بتایا وہ اس گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جارہا ہے''۔

"نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا! وہ مجھ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتی، میں اس کے بغیر اپنے معصوم بچے کے بغیر کیسے جیوں گا، اگر وہ واپس نہیں آئی تو......، میں اس گھر کو آگ لگادوں گا۔"

"مالک! ہم نے مالکن سے جاتے جاتے جو سنا وہی بتایا!"

"سلطان! تم جا کر اسے منا کر لے آؤ، میری طرف سے ان سے معافی مانگو اور انہیں بتاؤ، اب آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا، میں وعدہ کرتا ہوں معصوم بچے کا رونا میں برداشت کروں گا"۔

"مالک! اس بخت آپ جو یہ کہتا ہے اس کو آپ نے اب تک درجن بار بتایا ہے دوبار آپ مالکن کو میکے سے یہی وادا کر کے منا کر لایا ہے......"

مگر آپ نہ وادا پر قائم رہتا ہے، اور نا ہی برداشت کرتا ہے

"ہاں! یہ میری غلطی ہے پر میں کیا کروں، وہ گھر چھوڑ کر کیوں جاتی ہے"

"مالک! برا نہ مانے گا، آپ حالات ہی ایسے پیدا کرتا ہے آپ اس کو مارتا اور پیٹتا بھی ہے ایک بار وہ زخمی بھی ہوا ہے"۔

"ہاں! میرے ہاتھوں وہ تین چار بار زخمی ہوئی پر مرہم پٹی میں نے ہی کروائی!"

میں نے ان کی دلجوئی کی، انہیں سیر سپاٹے کو لیا، نئے فیشن کے کپڑے اور زیور دلائے!"

"مالک! اس نے سارا یہیں رکھا ہے معصوم بچہ کو بس ساتھ لیا ہے"۔

"کیا وہ واقعی اب واپس نہیں آئے گی؟"

''مالک! جب وہ روتے روتے گیا یہی بولا''۔

''سلطان! تم جا کر اسے منا کر لے آؤ، میری طرف سے معافی مانگوں!''

''مالک! میں وہاں نہ جا سکتا اب کے بار میرا ساتھ وہ نہیں آئے گا آپ کو خود جانا پڑے گا''۔

''میں وہاں خود جا نہیں سکتا، ساس سسر کو کیا منہ دکھاؤں گا، پچھلی بار ان کے سامنے وعدہ کیا تھا اب آئندہ ایسا نہیں ہوگا، کبھی نہیں ہوگا''؟ کہکر وہ خاموش ہوا اور خود ہی بولا

''سلطان! تم جا کر کہہ سکتے ہو، راشد میر شرمندہ ہے اور آپ سب کو منہ دکھانے کے قابل نہیں سمجھتا، لہٰذا نہیں ایکبار اور معاف کریں''۔

''اچھا مالک! میں کوشش کرتا ہے''۔

اگلے روز صبح سویرے سلطان مالکن کو لانے گیا البتہ خالی ہاتھ واپس لوٹ آیا۔ راشد میر کو بڑی پریشانی ہوئی، بیوی بچے کے بغیر اسے سب خالی خالی نظر آرہا ہے۔ خود کو قصوروار جان کر وہ خود کو ضرور کوس رہا ہے، البتہ اس طرح خود کوسنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں، بیوی بچے کی کمی نے اسے پریشان کر دیا، دن کو دفتر جا کر اور وہاں اپنے کام میں مصروف رہ کر وہ سب کچھ بھول تو جاتا البتہ کوٹھی پر واپس آکر گیراج میں کار رکھنے کے بعد جب وہ گیٹ سے اندر آتا تو دھک سے رہ جاتا، اسے مکان کے در دیوار کاٹ کھانے کو آتے سونے کے لئے بیڈ روم میں آکر وہ دیوانہ سا ہو جاتا، خالی کمرہ اسے کچوکے دینے لگتا اور وہ بیڈ پر آکر سر پیٹنے لگتا، نیند کوسوں دور جانے سے وہ صرف بیڈ پر کروٹیں بدل بدل کر

رات گزارتا، اس طرح تھکاوٹ محسوس کرکے صبح جاگنے کے ٹائم پر انہیں نیند آجاتی، کئی روز تک معمول کی زندگی میں خلل آنے کے سبب وہ سر درد کے ساتھ دل کے درد میں مبتلا ہو گیا، ڈاکٹر سے ملاحظ کروایا تو انہوں نے ٹینشن بتا کر دوا کھانے کے بجائے خود کو ذہنی دباؤ سے بچنے کی صلاح دی۔ البتہ انہوں نے ڈاکٹر کی صلاح ایک طرف رکھکر شام کو بیڈ پر آکر نیند کی گولیاں لینے شروع کیں۔ ہر روز شام کو سونے سے قبل نیند کو گولیاں لینے سے ان پر غنودگی طاری ہو گئی، چنانچہ مسلسل یہ گولیاں استعمال کرنے سے اب وہ اکثر اوقات میں نیند میں ہی رہنے لگے۔ یہاں تک نوبت آئی کہ وہ دن میں بھی سونے لگے، اور پھر نوبت یہاں تک آگئی کہ انہوں نے آفس جانا ہی چھوڑ دیا جب راشد میر رات اور دن میں بیشتر وقت بیڈ پر ہی گزارنے لگے تو ان کے گھریلو نوکر سلطان کو خدشہ ہوا کہ ان کے مالک کو کچھ نہ ہو جائے......، اس خدشہ کو لیکر وہ مالکن کے ہاں گئے اور وہاں راشد میر کی بیماری کو بڑھا چڑھا کر اس طرح پیش کیا کہ مالکن کے ساتھ ان کا والد، والدہ اور ان کا سالہ گاڑی میں بیٹھ کر یہاں آگئے اس وقت دن کے تین بجے تھے اور راشد میر بیڈ پر لیٹے تھے۔ جب انہیں جگایا گیا تو آنکھیں کھول کر اس نے بیوی نسرین کے ساتھ انکا پریوار دیکھا،

"یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے! ان کی ساس بولی؟"

قبل اس کی راشد میر کچھ بولتا ان کے سسر سلطان سے مخاطب ہوئے"۔

"اگر یہ اتنے دنوں سے بیمار ہیں ہم کو خبر کیوں نہ کر دی!"

نسرین کچھ کہنا چاہتی تھی کہہ نہ سکی، وہ ٹکٹکی باندھے راشد کو دیکھ رہی ہے۔

اتنے میں نسرینکے والد نے فون پر ڈاکٹر رشید خان کو بلوایا......

ڈاکٹر کے آنے تک شکوے شکایات کا دور چلا،

شام دیر گئے مالکن کے سوا سبھی اپنے گھر کو چلے، شام کو راشد میر اور نسرین نے اکٹھا کھانا کھایا، کچھ دیر بعد جب دونوں بیڈروم میں آ گئے،

تو نسرین نے شکایات آمیز لہجے سے پوچھا

"یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے"۔

"مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو، خود سے پوچھو، روٹھ کر جاتی ہو، تو مجھے کس کے سہارے چھوڑتی ہو؟"

"میں روٹھ کر جاتی ہوں، یا تم مجھے گھر چھوڑ کر جانے کیلئے مجبور کرتی ہو!"

"چھوڑو، ان باتوں کو، منا کہاں ہے"۔

"وہ میں نے گھر پر رکھا، اب وہ وہیں رہے گا"۔

"کیوں......؟ وہاں کیوں رکھو گی، مجھ پر اتنا بڑا ظلم کرو گی!"

"اسمیں ظلم کی کیا بات ہے، میری ماں کے پاس رہے گا۔ میری بہن نے اسے گود لیا ہے"۔

"نہیں، نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا" راشد چلایا۔

"چلاؤ مت......، آپ کی صحت ٹھیک نہیں، صبح ہونے دو دیکھ لینگے"

"نہیں میں نہیں مانتا، میں ابھی اسی وقت اپنے بچے کو لینے جاؤں گا، مجھ پر اتنا بڑا ظلم مت کرو، میں اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا"۔

"ایک پل نہیں رہ سکتے تو اتنے دنوں تک کیسے رہے، اب صبح تک انتظار کرو!"

''اچھا......، صبح تک انتظار کروں گا، لیکن تم؟ مجھ سے وعدہ کرو، اب کبھی مجھ کو چھوڑ کر روٹھ کر یہاں سے نہیں جاؤں گی''۔

''نہیں جاؤں گی، وعدہ!'' نسرین نے اپنا دائیں ہاتھ بڑھایا راشد نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا، اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔

حالات نارمل ہونے کے چند روز بعد راشد نے دفتر جانا شروع کیا اب اس کی حالت رفتہ رفتہ سدھرنے لگی، ان کا گھرانہ اپنی ڈگر پر واپس آیا۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں گزر گئے۔ باہر بارش ہو رہی تھی، نسرین کچن میں دودھ ابال رہی تھی سلطان سودا سلف لانے بازار گیا ہوا تھا۔ اور جب وہ بازار سے واپس آیا تو وہ ایک طرح سے دوڑتے بھاگتے اندر آ کر کچن میں آ گیا اور ہانپتے ہوئے مالکن سے بولا۔

''مالکن! صاحب آ گیا، وہ گاڑی گراج میں رکھا ہے ادھر بچہ روتا ہے آپ جا کر بچہ کو چپا کراؤ''

''یہاں دودھ ابل رہا ہے''

''مالکن! میں دودھ کو دیکھتا۔ آپ جا کر بچے کو چپ کرالو، ورنہ ہنگامہ ہوگا

''کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا، تم جا کر اس کے منہ میں فیڈر رکھ دو!''

کہنے کو تو انہوں نے کہہ دیا البتہ چولہے سے دودھ کا پتیلہ اتار کر اسے کونٹر پر رکھ کر خود ہی بچے کو سہلانے گئی۔ بچہ پالنے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رو رہا تھا کہ اتنے میں شاہد میر اندر آیا اور غصیلے لہجے سے بولا۔

''یہ یہاں کیا ہورہا ہے؟''

نسرین نے ان کی طرف ایک اچٹتی نظر ڈالی اور وہ بچے کو سہلانے لگی!

''میں پوچھ رہا ہوں، یہاں یہ کیا ہورہا ہے!''

''تم دفتر سے آ گئے، کپڑے بدل لو؟''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں، میں پوچھ رہا ہوں یہ یہاں گیا ہورہا ہے؟''

''کیا ہورہا ہے؟ خود دیکھ رہے ہو، زلزلہ ہورہا ہے، طوفان آرہا ہے تباہی ہو رہی ہے، آندھی چل رہی ہے موسلا دھار بارش ہورہی ہے، بجلی چمک رہی ہے اسلئے کہ معصوم بچہ رورہا ہے''

''یہ کیوں رورہا ہے؟''

''یہ مجھے اور میری قسمت کو رورہا ہے''۔

''بکواس بند کرو، میں پوچھ رہا ہوں، یہ بچہ رو کیوں رہا ہے''۔

''کہا نا یہ میری اور اپنی بدبختی پر رورہا ہے۔ کیونکہ یہ دنیا کا پہلا اور آخری بچہ ہے جو اس دنیا میں آکر رورہا ہے''۔

''میں نے تم کو کتنی بار کہا ہے میرے اس گھر میں معصوم بچہ رونا نہیں چاہے''۔

''میں نے اسے تمہارا حکم سنایا تھا پر یہ مانتا ہی نہیں!''

''دیکھو ٹالنے کی کوشش نہ کرو، اب برداشت کی حد ہوگئی ہے''۔

''اگر تمہیں معصوم بچے کا رونا برداشت نہیں تو کانوں میں روئی کیوں نہیں ٹھونستے!''

''میں اتنا مجبور نہیں''

''پھر اس کا گلہ گھونٹ دو، تا کہ یہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے''۔

اتنا کہہ کر نسرین نے روتا بلکتا بچہ اٹھا کر باپ کی گود میں دیا اور روتے روتے بولی، ''لو گھونٹ دو اس کا گلا''

راشد نے بچہ لینے سے انکار کیا، اس نے بچہ کو واپس کر دیا تو نسرین نے معصوم بچّے کے منہ پر ہاتھ رکھدیا، ''لو، اب میں ہی اس کو خاموش کرتی ہوں اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے، اس کے بعد میں بھی زندہ نہیں رہوں گی، یہ مسلہ آج ہی حل ہوگا!۔

قبل اس کے کہ ماں کے ہاتھوں بچے کا دم گھٹ جائے، راشد نے ان کے ہاتھوں بچے کو چھین لیا، اس نے بچے کو سلطان کے ہاتھوں میں دیا اور خود اپنے کمرے میں آکر اس نے اندر سے دروازہ بند کرلیا۔کوئی ایک گھنٹے کے بعد کمرے سے باہر آ کر وہ باہر چلا گیا۔ گیراج سے گاڑی نکالی، اور بغیر کہے پوچھے کہیں چلا گیا۔

نسرین ان کے چلے جانے تک اکیلے میں پھوٹ کر روئی اور جب وہ دوسرے کمرے میں آئی تو دیکھا شاہد میر نے نوٹ بک پر لکھا ہے۔

آج میں نے اقراری مجرم بنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

میں پشتی باشندہ بھدواہ کا ہوں، انجینئرنگ میں ڈپلومہ کر کے واپس آیا تو میری پہلی پوسٹنگ اوڑی پاور پروجیکٹ میں ہوئی یہاں مجھے رہائش کے لئے سرکاری کوارٹر ملا، اس سرکاری کوارٹر کے روڑ پر کچھ دوری پر لڑکیوں کا ایک سکول تھا۔ ایک لیڈی ٹیچر روزانہ صبح اس راستے گذر کر سکول جایا کرتی تھی ۔ میں

جب رہائش گاہ سے دفتر کے لئے نکلتا یہ لیڈی ٹیچر مجھے اس روڑ پر ملتی، ہماری یہ مڈ بھیڑ پیار محبت اور پھر شادی میں بدل گئی، شاذیہ نامی اس لیڈی ٹیچر کے والدین نے مجھے گھر داماد بنا دیا۔ یہ بڑے زمیندار لوگ تھے، انہوں نے مجھے اپنی رہائشی مکان کے پاس زمین کا خطہ دیا۔ یہاں ہم میاں بیوی نے اپنا ایک شاندار فلیٹ بنوایا۔ اس فلیٹ میں ہم ازدواجی زندگی گزارتے رہے۔ اسسٹنٹ انجینئر کی پو سٹ کے ساتھ مجھے ایک حسین اور خوبصورت جیون ساتھی مل گیا تو مجھے اپنی زندگی پر رشک آیا۔ آمدنی کا ذریعہ بھی معقول تھا بڑی عیش کی زندگی گزار رہے تھے۔

شاذیہ کی زبانی مجھے پتہ چلا اوڑی کا ایک جوان نورالدین جو اس کا دور کا رشتہ دار بھی ہے۔ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ البتہ نورالدین کی والدہ نے اپنی ایک پڑوسن کی بیٹی کو بہو بنانے کا نہ صرف فیصلہ کرلیا تھا۔ بلکہ پڑوسن کو وچن بھی دیا تھا لہٰذا یہ بیل منڈھے چڑھ نہ سکی میں نے دیکھا نورالدین شادی شدہ ہوکر شاذیہ سے گل مل رہا ہے۔ اس پر میں نے اعتراض کیا، اور شاذیہ کو سمجھا دیا۔ میں بڑا شکی مزاج ہوں لہٰذا نورالدین کے ساتھ میل ملاپ نہیں رکھنا۔ شاذیہ نے مجھے یقین دلایا ایسی کوئی بات نہیں اچانک کبھی کبھار ملتے ہیں تو اس سے کیا ہوگا میں تمہاری ہوں اور مرتے دم تک تمہاری رہوں گی۔

اس یقین دہانی کے باوجود میرے اندر شک پلتا رہا کیونکہ بعض اوقات اتفاقیہ یا غیر اتفاقیہ طور پر میں انہیں اکٹھے باتیں کرتے دیکھتا۔ اس سے میرے اندر کا شک غصہ بن جاتا۔ ہماری شادی کو ڈیڑھ سال ہو گئے۔ ہمارا پہلا بچہ ہوا ،شاذیہ کے ساتھ مجھے بھی سسرال کے گھر میں عارضی شفٹ کرنا پڑا، پورے چھ ماہ

تک سسرال میں قیام کرنے کے بعد ہم واپس اپنے فلیٹ میں آ گئے۔ شاذیہ نے دوبارہ سکول میں جوئین کیا وہ دن بھر بچے کو اپنی ماں اور چھوٹی بہن کے پاس رکھ چھوڑتی۔ ایک روز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں اپنی گاڑی میں دفتر سے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا نور الدین چھاتہ لیکر شاذیہ کے ساتھ گھر کی طرف آ رہے ہیں۔ بارش سے بچنے کے لئے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گویا چمٹ کر چل رہے تھے۔ یہ منظر دیکھکر میرا خون کھول اٹھا، میں نے غصہ کی حالت میں کار دوڑائی، گھر آ کر میں غم و غصہ سے شرابور ہوا، میں مٹھیاں بھیچ کر ہونٹ چچبا کر شاذیہ کا انتظار کرنے لگا۔ میرے اندر یہ شک تقویت پا گیا، ان دونوں کے درمیان اب بھی تعلقات ہیں اور ناجائز تعلقات، اس شک نے مجھے پاگل سا بنا دیا۔ میں اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹکرا کر پھوڑنا چاہتا، قبل اس کے کہ میں ایسا ہی کرتا شاذیہ آ گئی، اس کے ساتھ حسب معمول اس کی چھوٹی بہن ہمارا بچہ لیکر آ گئی۔ میں کمرے میں گویا انگاروں پر کھڑا تھا۔ شاذیہ نے کپڑے تبدیل کر کے بہن سے اپنے بیٹے کو لے لیا۔ اور سے پالنے میں رکھا، شاذیہ کی بہن واپس چلدی معصوم بیٹے نے رونا شروع کیا۔ شاذیہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"کپڑے کیوں نہیں بدلے"!

"میں نے ان کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھا، وہ ششدر سی ہوگئی، اور بولی کیا بات ہے؟"

"مجھ سے پوچھ رہی ہو، بات کیا ہے، یہ کندھے سے کندھا ملا کر ٹانگ کے ساتھ ٹانگ لگا کر چھاتہ کے نیچے کس کے ساتھ آرہی ہو مجھ سے ملا کے!"

''یہ کیا بک رہے ہو؟ شاذیہ چلائی''۔

میں بھی اسی لہجے سے بولا ، چلاؤ مت ، میں سب جان گیا ہوں ، تم وشواش گھاتی ہو، میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔

''گھونٹ دو، یہ ہے میرا گلا، گھونٹ دو!'' شاذیہ میرا ہاتھ پکڑ کر یہ اپنے گلے تک لے آئی میں نے اس کا گلا پکڑ کر دبا دیا۔ وہ خود کو چھڑانے لگی لیکن وہ میری گرفت سے نکل نہ سکی ، شک اور غصہ کی وجہ سے میرا دماغ ماوف ہوا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اس کا گلا زور سے دبا دیا وہ میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے گلے سے ہٹانے لگی اور بدقت بولی ''میرے معصوم بچے تم گواہ رہنا اور اے آسمان سے برسنے والی بارش تم بھی گواہ رہنا ، مجھے میرے پتی نے قتل کیا ، میں بے خطا بے قصور اور بے گناہ ہوں''۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اپنا ہاتھ ہٹا دیا شاذیہ دھڑام سے فرش پر گر گئی۔ وہ واقعی معصوم بچے اور بارش کو گواہ بنا کر دم توڑ چکی تھی ۔ میں ششدر ہو کر رہ گیا ، خلاف ارادہ اور خلاف توقع میرے ہاتھ سے خون ہوا ، میں نے ایکدم ارادہ بدل دیا، اور کھڑکی سے سسرال والوں کو پکارا،

''جلدی آجاؤ، شاذیہ کو کچھ ہو گیا، وہ چکر کر گر گئی ہے''۔

سسرال والوں کے آمد پر میں پاگلوں کی طرح چھاتی پیٹ پیٹ کر رو دیا۔ میں دونوں ہاتھ سر پر مارنے لگا۔ شاذیہ کے ہارٹ فیل ہو کر مرنے کا چرچا ہوا۔ پر گنہ کے سارے لوگ مرد عورتیں بوڑھے بچے آگئے اور ماتم میں شریک ہوئے ہارٹ اٹیک سے شاذیہ کے مرنے کے بعد اس کی تجہیز و تکفین ہو گئی۔

میں نے خود کو بیوی کا قاتل مان لیا اور اس کا دکھ ودرد لیا، البتہ وہ جو گواہ رکھ چھوڑ گئی ان کی مجھے کوئی فکر نہ ہوئی، کیونکہ دونوں گوہ بیان دینے کے قابل نہ تھے۔ وقت نے ثابت کر دیا یہ دونوں گواہ ایسے ہیں جن کو نہ توڑا جا سکتا، نہ خریدا جا سکتا اور نہ ہی جن کا منہ بند کیا جا سکتا۔ میں نے چار ماہ کے بعد اوڑی سے سرینگر تبدیلی کروائی البتہ ان دونوں گواہوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ سرینگر میں رہائش اختیار کرنے کے بعد جب میں نے دوسری شادی کر لی، اور میرا بیٹا ہوا تو یہ نوزائد جب جب رونے لگتا، مجھے لگتا یہ مجھے بتارہا ہے۔ تم قاتل ہو، تم خونی ہو، تم نے میری ماں کا قتل کیا ہے اس پر جب بارش ہوتی تو مجھے لگتا یہ بارش مجھے کوستی اور بتاتی تم نے ایک بے خطا بے قصور بے گناہ عورت کا قتل کیا۔ تم قاتل ہو، چنانچہ معصوم بچے کا رونا اور وہ بھی بارش کے دوران، میرے قاتل ہونے کی گواہی میرے اندر طلاطم پیدا کرتی رہی، اس طلاطم نے میرا دوسرا گھر اور دوسری بیوی کو بھی حقیقی زندگی گزارنے سے محروم کیا، ان کا جینا دوبھر کر دیا، اب میں اقراری مجرم بننے کے لئے پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔ وہاں اپنے خلاف ایف آئی آر درج کروں گا۔ اقراری مجرم ہونا قبول کروں گا......'

کیونکہ شاذیہ کے دونوں گواہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتے، یہ دونوں گواہ مجھے میرے کئے کیسزا دلانے پر بضد ہیں۔ لہٰذا میں پولیس اسٹیشن جا کر سرنڈر کرتا ہوں

فقط

شاہد میر

ﷺﷺﷺ

کلائمکس

ماہ جون کی گرمی کے دوران وادی کشمیر میں سیاحوں کی آمد سے صحت افزا مقامات کی جو رونق بڑھ جاتی ہے۔ سرینگر کے ڈلگیٹ سے لیکر ہارون تک اس کا خاصا اثر رہتا ہے۔ جھیل ڈل کی چہل پہل اپنی مثال آپ بن جاتی ہے۔ صبح سے شام تک ڈل جھیل کے کنارے ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ ملک اور بیرونیمما لکے سیلانی سیر و تفریح کا حظ اٹھا کر کشمیر آ کر دل بہلاتے ہیں۔ اس وقت بھی جھیل ڈل کے کنارے سیلانیوں کا کافی رش تھا۔ بلیوارڈ کے راستے پر جہاں مختلف رنگ کی کاریں اور گاڑیاں دوڑ رہی ہیں وہاں جھیل ڈل میں شکارے سیلانیوں کو لیکر تھر ک رہے ہیں۔ ہر جانب ایک دلکش اور رنگین سماں ہے ایک جوان خوبصورت عورت جھیل ڈل کے کنارے پھیری والے سے مونگ پھلی لے رہی ہے کہ اسی دوران ایک تیز رفتار کار نے یہاں پہنچ کر ایکدم بریک لگایا۔ کار ایک چیخ کے ساتھ روک گئی، راہگیروں کے کام کھڑے ہو گئے۔

اس کار سے ایک جوان مرد اتر آیا، اور مونگ پھلی لینے والی خاتون کے پاس آ کر حیرت و استعجاب سے بولا۔

''نیلم......!تم یہاں......''

''رمیش......!تم......، یہاں، یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں''؟

''میں نشاط کی طرف جارہا تھا۔تم پر نظر پڑی......، یقین نہیں آتا، میں یہاں تم کو دیکھ رہا ہوں۔''

''تم بھی کشمیر کی سیر کو آئے ہو، اکیلے ہو کیا؟''

''ہاں......!بالکل اکیلا......، تم تو جانتی ہو، میری بیوی کا ہوٹل مینجمنٹ کا جاب ہے وہ ایک ہفتہ سے زیادہ چھٹی نہیں لے سکتی، تمہارے ساتھ اور کون ہے؟''

''انیل، ہے۔ملک کا نامور افسانہ نگار انیل کمار آرہی

''کہاں ہے وہ......، میری بیوی کا پتی!'

''ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا کوئی نیا افسانہ لکھ رہا ہے۔میں بور ہوگئی۔باہر نکل آئی، جھیل ڈل کا نظارہ اٹھا کر ٹائم پاس کر رہی ہوں۔''

''اگر میرا انتظار کیا ہوتا تو اس وقت اس بور آدمی کے بجائے میرے ساتھ ہوتی میری اپنی اس کار میں یہاں سیر کو آتی!''

''یہ انتظار کا دوش گزشتہ دو سال سے تم دیتے رہتے ہو! ایسی بات تھی تو پہلے شادی کر لیتے پھر چار سال کے لئے ڈپلومہ کرنے جا سکتے، تب میرے انتظار میں جواز بنتا!''

''میں نے تمہیں کتنی بار کہا، ڈپلومہ کے لئے سلیکشن پر مجھے سوچنے کا کوئی موقعہ نہیں ملا، میں چار سال تک انگلینڈ جانے کی تیاری میں رہا''۔

''میرے ساتھ شادی بیاہ کر کے تم مجھے اپنے ساتھ لے سکتے''!

''بولانا، سوچنے کا موقعہ نہیں ملا، اگر یہ خدشہ ہوتا، میری غیر موجودگی میں تمہاری شادی ہوگی تو کوئی نہ کوئی اپائے کرلیتا''۔

''میں نے تمہیں بتایا، دوسال تک میں شادی بیاہ سے انکار کرتی رہی، البتہ والد صاحب کے سرگباش ہونے کے بعد مجھے سرنڈر کرنا پڑا''

''مجھے واپسی پر تمہارا یہ فیصلہ قبول کرلینا پڑا، یہ الگ بات ہے کہ میں تمہیں اب بھی اپنی بیوی مانتا ہوں۔''

''بیوی نہ بولئے، یار، بولئے دوست بولئے! اور یہ بھول جائے ہمارے آپس کے میاں بیوی کے جیسے تعلقات رہے ہیں''۔

''یہی مان کر اور جان کر میں آپ کے انیل کمار راہی کو میری بیوی کا پتی کہتا ہوں، اچھا یہ بتاؤ تم کس ہوٹل میں ٹھہری ہو؟''

''ہوٹل شاہین، روم نمبر 216 میں ہمارا قیام ہے''۔

''میں بھی اسی ہوٹل میں شفٹ کروں گا، اگر کمرہ خالی ہوگا''۔

''کمرے خالی ہوتے رہتے ہیں......، وہ دیکھو انیل کمار راہی آرہا ہے''۔

''اچھا، میں چلتا ہوں۔''

''ان سے نہیں ملوگے!''

''اس وقت نہیں......، آپ کے ہوٹل میں شفٹ کر کے ملاقات کریں گے، اچھا، میں جارہا ہوں...... بائی!''

رمیش چوپرہ کار میں بیٹھ کر نشاط کی طرف چلا گیا تو انیل نے سڑک کراس

کر کے نیلم کے پاس آ ک پوچھا......، یہ کون تھا؟ تم سے کیا کہہ رہا تھا''۔

''رمیشن چوپرہ، کرشن نگر دہلی میں ہمارا پڑوسی ہوا کرتا تھا، کشمیر کی سیر کو آیا ہے ، مجھ کو دیکھکر حال چال پوچھا''۔

''مجھے روم میں بیٹھ کر بڑی تھکاوٹ ہوئی، آؤ ادھر تک ایک ساتھ چہل قدمی کریں!''

''میں نے کتنی بار بولا، زیادہ دیر تک لکھنے پڑھنے میں نہیں رہنا، پر تم میرا کب سنتے، کب مانتے!''

''کہانی کو ادھورا چھوڑا نہیں جا سکتا، تم کیا جانو ایک ادیب کے لئے کہانی کی تخلیق عورت کے دردزہ کے برابر ہے۔ عورت جب تک بچہ نہیں جنتی، عذاب میں رہتی، یہی حال لگ بھگ کہانی کار کا ہوتا ہے''

''اب کہانی مکمل ہوگئی کہ نہیں!''

''سمجھو مکمل ہوگئی، البتہ ابھی کلائمکس لکھنا رہ گیا ہے، چلو، چہل قدمی کر لیتے ہیں''

دیر گئے ہوٹل کے کمرے میں آکر نیلم نے دیکھا کاغذ کے اوراق بکھرے پڑے ہیں۔ وہ ان کاغذات کو سمیٹنے لگی تو انیل نے منع کیا اور بتایا میں انہیں خود سمینٹ لیتا ہوں پیج نمبر کے مطابق!

''میں ان پڑھ نہیں ہوں۔ پیج نمبر میں بھی دیکھ سکتی ہوں''۔

''چلو، میں تمہارا ہاتھ بٹاتا ہوں۔''

دونوں نے کاغذات سمٹ کر پیج نمبر کے مطابق تہہ کرتے تو انیل بولا۔

''کہانی سنوگی، جو میں نے لکھی!''

''لیکن ابھی اسمیں کلائمکس نہیں آیا ہے۔ اسلئے کہانی ادھوری ہے''۔

''جتنی لکھی ہے اتنی سن تو لو!''

''اچھا بیٹھو اپنے صوفے پر، میں بھی بیٹھ لیتی ہوں۔''

انیل نے کاغذات ہاتھ میں لئے اور بتایا۔

''اس کہانی کا عنوان میں نے ''میری بیوی کا پتی'' رکھا ہے۔''

''میری بیوی کا پتی، یہ کیا نام ہے، یہ تو تم ہی ہوئے نا؟''

''عنوان سن کر نیلم چونک پڑی، اس کا رنگ تبدیل ہوا۔ البتہ ایکدم سنبھل کر بولی''

''ہاں! میں اپنی بیوی کا پتی تو ہوں، لیکن جس عورت کی یہ کہانی ہے اس کے دو پتی ہیں''۔

''کمال ہے، ایک مرد کی دو بیویاں ہو سکتی ہیں لیکن ایک عورت کے دو پتی یہ تو نئی اور انوکھی بات ہے''۔

''تمہارے لئے انوکھی بات ہو سکتی ہے پر چند روز قبل میں نے بلیوارڈ روڑ پر ڈل کے کنارے ایک شادی شدہ عورت کو دیکھا جو اپنے پتی کی آنکھیں بچا کر اپنے پریمی کے ساتھ محو گفتگو تھی۔ میں جانتا ہوں، اس پریمی کے ساتھ کبھی اس کے ناجائز تعلقات رہے ہیں۔ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے پر حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ ان کا ملاپ نہ ہو سکا''۔

''انیل..... یہ کیا کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے میں جان گئی ہوں، تم

مجھے یہ کہانی کیوں سناتے ہو، تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو، تم مجھے طعنہ دے رہے ہو
!"

"نیلم......! یہ تم کیا کہہ رہی ہو، کیا بک رہی ہو!"

"میں بک نہیں رہی ہوں۔ تم نے مجھے بنڈ پر رمیش چوپڑہ کے ساتھ باتیں کرتے کیا دیکھا کہ تمہارے دماغ میں فتور سمایا۔"

"نیلم......! تم میری کہانی میں خودکو اور رمیش چوپڑہ کو کیوں لارہی ہو؟"

"تمہاری اس کہانی کو مجھے سنانے کا مقصد کیا ہے؟"

"تم بھول رہی ہو کیا جب بھی میں کوئی افسانہ لکھتا ہوں، تم کو پڑھکر سناتا ہوں یا اس افسانے کی تھیم بتایا ہوں۔"

"وہ میں مانتی ہوں، یہ آج تم افسانہ نہیں سناتے بلکہ ڈرامہ، تم ڈرامہ کر رہے ہو؟"

"نیلم، تم کو کیا ہو گیا، یہ تم کیا کہہ رہی ہو! میں تمہارے سامنے ڈرامہ کر رہا ہوں"

"بالکل" لہجہ بدل کر "مسٹر انیل کمار راہی! آپ ایسا کریں، مجھے دہلی واپس بھیجدیں، میں اب یہاں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی!"

"کیا کہا، تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتی، تم کو اس کا احساس ہے یہ تم کیا کہہ گئی ہو!"

"ہاں! مجھے پورا احساس ہے" اتنا کہکر نیلم صوفہ سے اٹھ گئی، انیل کے ہاتھ سے کاغذات لیکر ان کو پھاڑ کر پھینک دیا اور بڑبڑاتی ہوئی کہ بولی

''عورت کے بارے میں تمہارا فیصلہ یکطرفہ ہے''

''نیلم، تم نے میری کہانی پھاڑ دی، یہ تم نے میرا جگر پھاڑ دیا، میرا دل توڑ کر رکھدیا، یہ عورت کہانی کا ایک کردار ہے''۔

''یہ سب بکواس ہے، بیہودگی ہے، غلط اور بے بنیاد ہے''۔

''نیلم، کہانی میری، کردار میرے، پلاٹ میں نے بنایا، مرچی تم کو لگیں، بس کیوں؟''

''کیونکہ یہ تمہارا یکطرفہ فیصلہ ہے''۔

''کہانی کی تخلیق میں کہانی کار کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے، یہ تم نہیں جانتی، لیکن تم نے اس کو پھاڑ کیوں دیا؟''

''مجھے ایسا ہی کرنا تھا''۔

''نیلم! ہوش سے کام لو، ورنہ بہت برا ہوگا، جس طرح تم نے میری یہ کہانی پھاڑ دی اسی طرح میں تم کو توڑ کر رکھ سکتا ہوں''۔

''مجھے اسی کا انتظار ہے''۔

''دیکھو، مجھے اشتعال دینے کی کوشش مت کرو، تم نے جو یہ کہانی کاٹ دی ہے ہے نا اس کے جواب میں تمہارے یہ ہاتھ میں کاٹ سکتا ہوں''۔

''تم نے سارا دوش عورت پر کیوں ڈالا؟''

''یہ کردار ہی کچھ ایسا ہے کہ جس کا دوش گناہ کا روپ دھارن کر رہا تھا۔ اور یہ معاملہ میرا اور کہانی کے پلاٹ کے درمیان تھا۔ تم نے بیچ میں ٹانگ کیوں اڑا دی؟ اگر تم کو اس کہانی میں اپنا پن نظر آیا تو اسمیں میرا کیا قصور ہے''۔

''اب تم اصلیت پر آ گئے نا، دراصل تم مجھ سے یہی کہنا چاہتے تھے، اس کے لئے ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت''۔

''نیلم! اگر میں نے کوئی ڈرامہ کیا، یا اس کہانی کے ذریعہ تم سے کچھ کہنا چاہا تو مجھ پر لعنت، میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں یہ ایک کہانی ہے اور اس کی تحریک مجھے ایک اخباری خبر سے ملی، اس خبر کے مطابق ایک شادی شدہ عورت اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں روزانہ ایسے کئی واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔''

''ہم جیسے افسانہ نگاروں کو انہی حالات اور واقعات سے مواد ملتا ہے اورا اسی مواد کو لیکر ہم افسانے اور ناول لکھتے ہیں''۔

''افسانے اور ناول من گھڑت بھی ہوتے ہیں''؟

''ہاں ہوتے ہیں! اور من گھڑت کہانی کو سن کر ہی تمہارے اندر کا شیطان باہر آ گیا، اور آج تمہارا ظاہر اور باطن آشکارا ہو گیا''

قبل اس کے نیلم کچھ اور کہدیتی وہ سر جھکا کر سوچنے لگی انیل کمار پھٹے ہوئے کاغذات کو تہہ کرنے لگا، اس نے تہہ کر کے انہیں اپنے بیگ میں رکھا دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔ نیلم کھڑی ہوئی اور پتی کے سامنے کھڑی ہو کر بولی۔

''مسٹر انیل کمار راہی آپ کی اس کہانی سے ہمارے درمیان جو دراڑ پڑ گئی، اس سے لگتا ہے اب ہمارا نبھاہ قائم نہیں رہ سکے گا۔''

''نیلم، اتنی سی بات بنا کر تم نے رشتہ اور ملاپ متزلزل کر دیا، تم اس حد تک

جاسکتی ہو، میں سوچ بھی نہیں سکتا، تم اس وقت میری نظروں سے دور ہو جاؤ، ورنہ نہ جانے میں کیا کر بیٹھوں گا۔"

"میں کہاں، کدھر جاؤں، تم مجھے جہاں سے لائے ہو، وہیں لیجاؤ!"

"اس کے بارے میں، میں تمہیں واپسی پر بتادوں گا، اس وقت میں ریڈیو اسٹیشن انٹرویو دینے جارہا ہوں،

نیلم کمرے میں اکیلی بیٹھی پچھتا رہی ہے اس کی آنکھوں میں آنسو ناچ رہے ہیں وہ مستقبل کے بارے میں فکر مند ہو رہی ہے۔ نہ جانے واپسی پر انیل کمار راہی کا فیصلہ کیا ہوگا وہ اسی سوچ میں تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے، دروازہ کھلا ہے"۔

دروازہ کھلتے ہی رمیش چوپڑہ اندر آیا۔

نیلم اس کی طرف دیکھ کر چونک گئی اور ہکلائے بولی

"رمیش......تم ......اس وقت......

"میری آمد سے تم پریشان سی ہوگئی ......کیوں!

"نہیں تو، آؤ، بیٹھو......ادھر......"

نیلم صوفہ پر سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"نیلم، تم اس وقت بڑی اداس لگتی ہو، تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں"۔

"نہیں، ایسی کائی بات نہیں"۔

"میری بیوی کا پتی کہاں گیا؟

"ریڈیو اسٹیشن گیا، وہاں آج اس کی زندگی اور ادب پر انٹرویو لیا جارہا ہے"

''میں نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا، دراصل میں کچھ دیر سے باہر کھڑا تم دونوں کے درمیان جھگڑے کو سن رہا تھا۔''

''میرا خیال ہے انیل ہمارے درمیان کے تعلقات کے بارے میں جان گیا ہے''۔

''میرا بھی یہی اندازہ ہے، لیکن ان کا بھگوان کو سوگند کھانا مجھے کچھ عیب سا لگا، نیلم اگر وہ سچ کہہ رہا ہے تو یہ بات ممکن ہے اس کی کہانی کی عورت تمہارے ساتھ مطابقت رکھتی ہے اور اس کہانی کا نفسیاتی اثر تمہارے ذہن پر کچھ ایسا پڑ گیا کہ اس نے تمہیں کچوکے دیئے، تم کو شک ہو چلا یہ مجھے میری کہانی سناتا ہے''۔

نیلم کچھ سوچ کر بولی۔

''رمیش! تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کی کہانی کا عنوان ''میری بیوی کا پتی'' اور جس عورت کے کریکٹر پر کہانی لکھی گئی ہے وہ میرا ہی روپ ہے۔ البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عورت کو جتنا زیادہ مورد لزام ٹھہراتا ہے اتنا وہ نہیں ہے بلکہ قصور اصل میں

رمیش بات کاٹ کر'' قصور دراصل میرا ہے''۔

''ہاں! کیوں نہیں، تم نے اپنا کیریر بنانے کے لئے مجھے ایک طرح سے چھوڑ دیا، حالانکہ بن پھیرے ہم ایک دوسرے کے ہو چکے تھے۔''

''مجھے پورا بھروسہ تھا تم میرا انتظار کرو گی، تم نے نہیں کیا ہمارے آپس کے میل ملاپ کو دیکھکر تم باغی بن سکتی، مگر تم نے ایک اجنبی کے ساتھ شادی بیاہ کرنے پر گھر والوں کے سامنے سرنڈر کیا

''رمیش، تم بھول کیوں رہے ہو، جب تم ڈپلومہ کر کے واپس آ گئے تو شادی شدہ ہو کر بھی میں تمہارے پاس آئی تھی۔ میں نے تمہیں بتایا تھا میں انیل کمار سے طلاق لے لوں گی، لیکن تم نے ایسا کرنے سے منع کیا''

''آج مجھے تمہاری حالت دیکھکر، ایک خشک اور بور شخص کے ساتھ زندگی گزاتے دیکھکر تم پر رحم آ رہا ہے۔ اور میں خود کو کوس رہا ہوں، میں یہ بھی جان گیا ہوں تم دونوں کے درمیان ایک دراڑ پڑ گئی ہے، انیل کمار واپسی پر کیا فیصلہ سنائے گا اس کا مجھے خدشہ ہو رہا ہے''۔

نیلم کچھ سوچنے لگی، اور پھر گھمبیر لہجے سے بولی، ''میں محسوس کر رہی ہوں، میں نے اپنے پتی کے ساتھ بڑی زیادتی کی اس کی کہانی توڑ کر اس کا دل توڑا، وشواش توڑا اس پر اسے اشتعال بھی دلایا، یہاں تک کہ میں نے ان سے چھٹکارا پانے کا عندیہ بھی دیا، اب میں پچھتا رہی ہوں، مجھے اس حد تک جانا نہیں چاہیے تھا۔ میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں اور سوچ رہی ہوں......

رمیش نے بات کاٹ کر پوچھا...... ''کیا......، کیا سوچ رہی ہو''!

''وہ واپس آئیں گے تو، میں......، میں ان سے معافی مانگ لوں گی!''

''کیا تمہاری معافی مانگنے سے ان کے اندر پیدا ہونے والا شک دور ہو سکے گا تم دونوں کے درمیان رشتہ ازدواج کے ساتھ میل ملاپ میں جو دراڑ پڑ گئی ہے۔ وہ بھر سکے گی؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا، میں اپنی طرف سے سہاگ کو بچانے کی کوشش کروں گی''

"ٹھیک ہے، دیکھے لو، آزمائش شرط ہے، ویسے......، اس وقت کیا خیال ہے؟"

نیلم نے کن آنکھوں سے دیکھکر پوچھا "کس بارے میں!"

"یہاں اکیلی بیٹھ کر کیا کرو گی، جب تک انیل کمار آتا ہے ہم چشمہ شاہی تک جائیں گے، کچھ دل بہلائی ہوگی، تم اس الجھن سے باہر آؤ گی!"

"نہیں، میں اس وقت کہیں نہیں جاسکتی، من بڑا اداس ہے۔"

"اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں، من کو شانتی دینے کی ضرورت ہے، اٹھو، ہم جلدی واپس آئیں گے"۔

نیلم نہیں مانی، رمیش نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھالیا۔ اپنے سینے کے ساتھ لگایا، اور پھر اپنی باہوں میں لیکر اسے کمرے سے باہر لے آیا۔

انیل کمار راہی شام کو دیر گئے واپس ہوٹل کے کمرے میں آگیا، نیلم اس وقت بیڈ پر لیٹی تھی، نیلم کے چہرے سے چادر ہٹا کر بولا۔

"نیلم! اٹھو ڈنر کر لیتے ہیں۔"

"آپ جایئے، مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"بھوک کیوں نہیں ہے، کچھ کھالیا ہے کیا......؟"

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے، مجھے کچھ نہیں کھانا، کچھ نہیں پینا ہے!"

"اگر یہ بات ہے تو میں بھی، میں بھی کچھ نہیں کھاوں گا، میں بھی بھوکا سو لوں گا"

اتنا کہکر انیل نے کپڑے بدل دئے، نائٹ سوٹ پہن کر بیڈ پر آیا تو نیلم

نے اٹھ کر ڈنر کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ دونوں اٹھ کر باہر آئے، اور دروازہ پر تالا لگا کر ڈنر کرنے نیچے، ڈائنگ ہال میں آگئے۔ خلاف معمول ڈنر کا آڈر انیل کمار نے دیا، ڈنر کر کے واپس کمرے میں آگئے۔ بیڈ پر سو گئے، خلاف معمول آج ایک طرح سے الگ الگ سو گئے نہ کوئی گفتگو کہ نہ کوئی دل بہلائی کی، دونوں کی آنکھوں سے گویا نیند غائب تھی، دونوں رات بھر صرف کروٹیں بدلتے رہے، آپسمیں نہ کوئی بات کی نہ کوئی شکوہ کیا، نہ کوئی شکایت ہوئی، اور رات یوں ہی گزر گئی۔ چونکہ رات دونوں نے کروٹیں بدل بدل کر اور ایک دوسرے کی آہوں کا سامنا کر کے گزاری صبح کے وقت انہیں نیند آ گئی۔ اگر ہوٹل کا بیرا انہیں بیڈ ٹی کے لئے دستک نہیں دیتا غالباً وہ دیر تک سوتے رہتے بیرے نے ٹی کی ٹرے رکھدی انیل بولا آج ہم ناشتہ اپنے کمرے میں کریں گے ناشتہ یہیں لانا۔ بیرے کے واپس جاتے ہی انیل باتھ روم میں گیا، نہا دھو کر واپس آیا تو نیلم کے سر کو ہلا کر بیڈ سے اٹھنیکو کہا

کچھ دیر بعد بیرا ناشتہ لیکر آیا چائے کے ساتھ سلائس اور آملیٹ رکھکر واپس چلا گیا اتنی دیر میں نیلم باتھ روم سے باہر آئی

انیل نے اشارے سے سامنے بیٹھنے اور ناشتہ کرنے کو کہا، نیلم نے اشاروں میں ناشتہ نہ کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔

''نیلم! بیٹھو، ناشتہ کرلو، ٹھنڈا ہو جائے گا، انیل نے زبان کھولی''

''مجھے رغبت نہیں، درد سے سر پھٹا جا رہا ہے''۔

''میرے پاس کیسں کی دوائی ہے تم ناشتہ کرلو، بعد میں دوائی لینا''۔

نیلم بیٹھ گئی، اور بادل ناخواستہ ناشتہ کرنے لگی، یکا یک ان کی آنکھوں سے آنسوٹپک پڑے اور وہ رونے لگی!

''نیلم، یہ کیا کررہی ہو، رونے سے سر درد بڑھ جائے گا''۔

نیلم دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

انیل نے کچھ کہنا پوچھنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا اور نہ پوچھ سکا، اس نے ناشتہ سے ہاتھ روک لیا، جب نیلم کی روتے روتے ہچکیاں ہونے لگیں تو انیل کھڑا ہوا۔ اور نیلم کو پکڑ کر کھڑا کیا، اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ کر بولے۔

''لگتا ہے تم مجھ پر اب بھی ناراض ہو، حالانکہ میں نے اپنا سارا غصہ تھوک دیا ہے۔

''انیل، مجھے معاف کردو، مجھے بخش دو، میں نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی''؟

''زیادتی مجھ سے بھی ہوئی، چلو ہم دونوں کل کو بھول جاتے ہیں، بیٹھو ناشتہ کر لیتے ہیں''۔

انیل نے نیلم کو اپنے سامنے کرسی پر بیٹھا دیا۔ سلائس کے ٹکڑے پر آملیٹ کا ٹکڑا رکھکر نیلم کے منہ کے پاس لے آیا۔

''منہ کھولو!''

نیلم نے انیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر منہ کھول لیا، اس کے بعد اس نے بھی سلائس اور آملیٹ کو مکس کر کے انیل کے منہ میں ڈالا، ناشتہ کے دوران دونوں شہد و شکر ہو گئے۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی، انیل نے نیلم کو اشارے سے بتایا دیکھ لینا کون ہے؟

نیلم نے اٹھ کر دروازہ کھولا، رمیش چوپڑہ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔

"آپ، آیئے اندر آیئے! نیلم حیرت واستعجاب سے دیکھکر بولی"۔

"اندر آنے کے لئے تو آیا ہوں، ملک کے نامور ادیب افسانہ نگار ناول نگار سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا ہے"۔

"آیئے، بیٹھئے، یہاں!"

جب وہ صوفہ پہ بیٹھ گیا۔ تو انیل بولا "اپنا تعارف......"

نیلم بولی "یہ رمیش چوپڑہ ہیں!"

"اچھا، یہ رمیش چوپڑہ ہیں، ان کا ذکر کبھی کبھی گھر میں چلتا ہے، آپ بھی کشمیر کی سیر کو آئے ہیں"۔

"جی ہاں، ویسے میں ہر سال ایک آدھ مہینے کے لئے کشمیر آتا ہوں، آج پہلی بار اپنی کار میں آیا ہوں"۔

"تو اس کا مطلب ہے آپ کو اپنی مرضی سے گھومنے پھرنے اور صحت افزامات کا لطف اٹھانے کا خوب موقعہ ملتا ہے، آپ اکیلے آئے ہیں کیا"۔

"ہاں! اکیلا آیا ہوں، شادی جب ہوئی تو اس وقت ہنی مون منانے دلہن کے ساتھ لایا تھا"۔

"اب بیوی کو ساتھ کیوں نہ لائے...... میری طرح!"

دراصل ان کا جاب ہی کچھ ایسا ہے کہ انہیں چھٹی ہی نہیں ملتی۔

''آپ کام کیا کرتے ہیں''۔

''میں پاورڈ یپارٹمنٹ میں ٹیکنیکل انجینئر ہوں''۔

''او، تو آپ ٹیکنیکل انجینئر ہیں، لیکن ادب کے ساتھ لگاؤ!''

''سچ پوچھئے تو ادب کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں، البتہ آپ کی چند ایک کہانیاں اور ایک ناول پڑھا ہے، ایک مدت سے آپ سے ملاقات کا شوق رہا۔''

''آپ کو کس نے بتایا، میں یہاں آیا ہوں اور یہاں اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں''۔

''میں بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوں، پرسوں آپ کی مسز جھیل ڈل کے بنڈ پر ملی، اسی نے بتایا میں اپنے پتی انیل کمار راہی کے ساتھ آئی ہوں''۔

''اچھا تو یہ بات ہے؟ آپ کے لئے چائے منگوائیں''

''میں نے ناشتہ کرلیا ہے، بس ملاقات کا شوق تھا وہ پورا ہوا، میں اس وقت پہلگام سے آگے ایک اہم سپارٹ ''بوئے سرن'' جارہا ہوں''۔

''کیا بہت خوبصورت سپارٹ ہے''

''دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے انگوٹھی میں نگینہ ہے، میرا اپنا ماننا جس نے کشمیر آکر بوئے سرن کو نہیں دیکھا اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا!

اچھا، یہ بات ہے ہمیں صرف پہلگام، گلمرگ، سنہ مرگ، اچھ بل، ویری ناگ اور ککرناگ جانتے ہیں بس!

''اگر میں دعوت دوں، تو چلئے آپ دونوں میرے ساتھ، اپنی کار ہے، ساتھ چلیں گے تو خوب گزرے گی؟''

انیل نے نیلم کی طرف دیکھا اور پوچھا، ''کیا خیال ہے تمہارا، چلیں؟''

''آپ کی مرضی! نیلم نے جواب دیا''۔

''میرا من کہتا ہے، مفت کی سواری ہے، چلنا چاہیے، یقیناً خوب گزرے گی!''

رمیش کھڑا ہوا اور بولا، آپ دونوں تیار ہو کر نیچے آجایئے، میں انتظار کروں گا۔

رمیش کے باہر نکلتے ہی دونوں نے اٹھ کر کپڑے تبدیل کئے، نیلم نے اپنا ہنڈ بیگ اور انیل نے اپنا لیدر بیگ اٹھایا، کمرہ تالا کر کے دونوں نیچے لان میں آگئے رمیش نے انہیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔

دن کے دو بجے انہوں نے پہلگام میں لنچ کیا، بل رمیش چوپڑہ نے ادا کیا، گاڑی کو یہیں رکھ چھوڑ کر تینوں بوئے سرن کی طرف پیدل چل پڑے راستے میں تینوں ایک دوسرے کی سناتے گئے، ہنسی مذاق کرتے رہے، پہاڑ پر چڑھتے ان کی سانسیں پھولنے لگیں۔ تھکاوٹ بھی محسوس ہوئی۔ پہلگام سے کوئی پانچ کلومیٹر چل کر ایک نالے کے پاس ستانے لگے، نالے کا ٹھنڈا میٹھا پانی پی کر پیاس بجھائی، نیلم نے پوچھا

''یہ بوئے سرن'' ابھی کتنی دوری پر ہے''۔

رمیش نے جواب دیا، بس ایک آدھ کلومیٹر کا فیصلہ ہے، رمیش نے اخبار میں لپٹا تندوری چکن نکالا، جو انہوں نے لنچ کے دوران ریسورنٹ سے پیلک کرایا تھا۔ چکن کے تین حصے کر کے رمیش نے اس کے دو حصے انیل اور نیلم کو پیش

کئے۔ اخباری کاغذ میں چکن کے حصہ لیکر تینوں اس کو نوش کر رہے تھے کہ انیل گویا چونک پڑا، ان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا، ......مل گیا......،

''کیا، کیا مل گیا، نیلم اور رمیش نے ایک ساتھ پوچھا''

''میری کہانی کا کلائمکس مل گیا، یہ دیکھو!''

انیل نے انہیں اخبار کا ایک ٹکڑا دکھایا اور بولا'' یہ ہے میری کہانی کا کلائمکس! میں پڑھکر سناتا ہوں''

''عورت اپنے پتی کو پریمی کے ساتھ سیر کو لیجاتی ہے، سیر کا دراصل بہانہ ہوتا ہے اصل میں دونوں صلح مشورہ کرکے عورت کے پتی کو ٹھکانے لگانے یعنی جان سے مارنے کے لئے پہاڑ کے سیر کو لیجاتے ہیں''۔

انیل کمار راہی کے کلائمکس کے بارے میں اس انکشاف پر رمیش اور نیلم ششدر ہوکر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں، انیل نےبتایا اور سنایا اس کی طرف انہوں نے کوئی دھیان نہ دیا، رمیش کا خون کھول اٹھا اور وہ راہی سے مخاطب ہوکر بولا

''آپ کا یہ الزام غلط اور بیہودہ ہے''۔

''کونسا الزام، کیسا الزام......؟''

قبل اس کے کہ رمیش جواب دیتا نیلم نے ٹوکتے ہوئے کہا

''یہ کہانی کا کلائمکس نہیں بلکہ یہ تمہارا پاگل پن ہے تم ہم دونوں پر خون کرنے کا الزام لگا رہے ہیں''۔

رمیش نے بات آگے بڑھادی

''میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا آپ اس حد تک گر سکتے ہیں، اگر آپ کو اس بات کا خداشہ تھا، پھر ہمارے ساتھ آئے کیوں؟''

انیل کچھ سوچنے لگا پھر بولا، ''مجھے دال میں کالا نظر آنے لگا ہے، میرے کلائمکس سے تمہارے اندر کا چور باہر تو نہیں آیا ہے؟''۔

''انیل کمارراہی''! نیلم طنزیہ انداز سے بولی، ''آگر آپ کو ہم سے کچھ کہنا ہے تو صاف صاف کیوں نہیں کہتے، کہانی سنا کر یہ ڈرامہ کیوں کررہے ہیں''؟

''نیلم، اسی کو کہتے ہیں، چور کی داڑھی میں تنکا، اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو میرا تم پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ اب تمہارے ساتھ میرا نبھاہ نہیں ہوسکتا!......تم نیمیرا وشواس گھات کردیا، اس کا حساب تم سے چکا دیا جائے گا''۔

''انیل کمارراہی!'' رمیش ماتھے پر شکن لاکر بولا، ''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔

''آپ نیلم سے بدلہ لیں گے اس سے پہلے ہی آپ کا کام تمام ہوگا''

''یعنی آپ مجھے قتل کریں گے!''

''ایسی ہی نوبت آرہی ہے، کیونکہ آپ نیلم اور میرے درمیان کے تعلقات کے بارے میں جانکاری رکھتے ہیں، اس کے آج آپ سے تصدیق مل گئی، اب آپ نیلم کو اس کی سزا دیں گے، ایسا میں نہیں ہونے دوں گا''۔

''آپ کیا کریں گے؟''

''آپ کا خاتمہ......!'' اس کے ساتھ رمیش چوپڑہ کھڑا ہوا، اس نے پتلون کی جیب سے چھوٹے سائز کا پستول نکالا''۔

انیل ششدر ہوکر بولا ''اچھا' تو آپ پستول بھی ساتھ لائے ہیں''۔

''پستول اکثر میرے ساتھی ہوتا ہے، آج تک اس سے پرندہ بھی نہیں مارا گیا ہے مگر آج پہلی بار میں آپ کو......''

نیلم چلائی ''رمیش! یہ آپ کیا کہہ رہے، کیا کر رہے ہیں، آپ کا دماغ ٹھیک ہے''۔

''نیلم، میرا دماغ ٹھیک ہے تم ہوش میں آؤ، تمہارے ساتھ انیل راہی کے ہاتھوں کیا ہونے والا ہے۔اس کا اندازہ کرلو، نیلم! تم کو آج اسی وقت اور یہیں پر فیصلہ لینا ہے!''

''یہ کیا فیصلہ لے گی، فیصلہ میں نے لینا ہے'' انیل جھٹ بولا ''اور میرا فیصلہ یہی ہے کہ میں نے نیلم کو آج ابھی اور اسی وقت اپنے رشتے سے خارج کر دیا''۔

''نہیں، نہیں، نہیں!'' نیلم دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر چلانے لگی۔

''تمہارے چلانے سے اب کچھ نہیں ہوسکتا، یہ جاننے کے بعد کہ تمہارے اس مرد کے ساتھ تعلقات رہے ہیں، اب میرا تمہارے ساتھ رہنا کیا چھونا بھی پاپ ہے تم دونوں جاسکتے ہو، میرا کوئی اعتراض نہیں''۔

قبل اس کے نیلم کوئی جواب دیدیتی، رمیش نیلم سے مخاطب ہوا۔

''انیل راہی کا فیصلہ سن کر اب تمہارا کیا فیصلہ ہے۔ کیا ارادہ ہے؟''

نیلم آگے بڑھی اس نے رمیش کے ہاتھ سے پستول لیا، اپنی کنپٹی پر رکھکر فائر کیا اس کے سر سے خون کا پھنوارہ پھوٹ پڑا۔

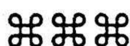
نیلم کے سر سے خون کی دھار بہتے دیکھکر انیل ششدر ہوکر بولا۔ ''یہی اس

کیا اس کے سر سے خون کا پھنوارہ پھوٹ پڑا۔

نیلم کے سر سے خون کی دھار بہتے دیکھکر انیل ششدر ہو کر بولا۔ ''یہی اس کہانی کا کلائمکس ہے''۔

دو روز بعد ایک مقامی اخبار میں خبر آئی۔

''پہلگام سے پانچ کلومیٹر دور ایک خاتون سیاح کی لاش پائی گئی''۔



ہماری مطبوعات

اردو میں معلوماتی اور ترسیلی ٹیکنالوجی	سید ظہور گیلانی	پھوپونی ٹوٹر	دلدار اشرف شاہ
آئین جموں کشمیر	ترتیب رشید احمد	ریزہ ریزہ حیات	دیپک بدکی
کشمیر کہانی (افسانے اور ڈرامے)	نور شاہ	شہ زور کاشمیری شخص اور شاعر	مرحوم فرید پربتی
مثنوی کی ادبی جہات	پروفیسر شہاب عنایت ملک	دہشت زادی (ایک کشمیری خاتون کی داستان)	نعیمہ احمد مہجور
لہو لہو کشمیر	طاہر مظفر	کشمیر نامہ جدید (جلد ۱۔۲۔۳۔)	نور شاہ، جان محمد آزاد
اقبال اور نظریہ تصوف	پروفیسر بشیر احمد نحوی	تقسیم ہند اور ناول کرماں والی	شاہینہ اختر
فرید پربتی شخص اور ادبی جہات	محمد اقبال لون	اماتم دوہہ کوت سناگئے	دلدار اشرف شاہ
سلام الدین کا ہاؤس بوٹ	دیپک کنول	تمثیل داغ ریڈیائی ڈرامہ	اشرف عادل
ترقی پسند کشمیری ادب کی تاریخ	پروفیسر مشعل سلطان پوری	وتستا کی سیر (جہلم کی کہانی)	ڈاکٹر عزیز حاجنی
کامیاب زندگی دنیا اور آخرت میں	منتہی قریشی	کشمیر میں تصوف ریشیت کے تناظر میں	سیار محمد سعید قادری
ساتویں در کا شاعر حکیم منظور	ڈاکٹر نکہت نظر	کشمیر قلم	محمد یوسف ٹینگ
بھدرواہ کے معتبر اردو شعراء	پروفیسر شہاب عنایت ملک	پروائی (اخباری کالم)	مرحوم عبدالرحمان مخلص
یادوں کے لمس	پروفیسر شہاب عنایت ملک	درس اخلاقیات (اخلاقی مضامین)	ابن حبیب
کالے دیوؤں کا سایہ	ڈاکٹر ریاض توحیدی	جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار	محمد سلیم سالک
مٹھی بھر ریت (افسانے)	دیپک بدکی	اقبال اور تصور عبدیت	سالک بلال
اردو میں علاقائی ناول کا ارتقاء	ڈاکٹر شگفتہ تبسم	اردو ناول تحقیق و تنقید	ڈاکٹر طارق تمکین
جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار	نور شاہ	غالب جہان دیگر	حامدی کاشمیری
حضرت شیخ العالمؒ حیات اور کارنامے	ابو نعیم	ارمغان شہاب	شہاب عنایت ملک
نظریہ اجتہاد اور اقبال	ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی	مضامین شہاب	شہاب عنایت ملک
عصری تقاضے تنقیدی مضامین	دیپک بدکی	کالے پیڑوں کا جنگل	ڈاکٹر ریاض توحیدی
قدم قدم تعزیر	محمد مقبول ساحل	پروفیسر مرغوب بانہالی کی اردو ادبی خدمات	شبیر احمد بٹ
تجزیاتی مطالعے (حامدی کاشمیری کے مضامین)	ترتیب جاوید ماٹجی	ورق ورق آئینہ	فرید پربتی
کشمیر میں اقبال شناسی کا سفر	ڈاکٹر پیر نصیر احمد	اقبال اور اقبالیات	پروفیسر عبدالحق
میر شناسی	ڈاکٹر بشریٰ عارفہ	شبستان وجود ایک صحافی کی سرگزشت	مقبول ساحل
صحبت صالحین فکر اقبال کی روشنی میں	ڈاکٹر فیض احمد فیاض	عمر مجید کے بہترین افسانے	سلیم سالک
زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی	دیپک بدکی	تعلیقات اقبال	مشعل سلطان پوری
آہ سحر گاہی	ڈاکٹر فیض احمد فیاض	پروفیسر مرغوب بانہالی بحیثیت اقبال شناس	ڈاکٹر پیر نصیر احمد
اردو شاعری کا مزاج	وزیر آغا	دیپک بدکی کی افسانہ نگاری	جاوید اقبال شاہ
دور جدید ادب اور ہم	عمران ناک	گردش دوراں	حسن ساہو
مکاتیب اقبال کے ادبی پہلو	ڈاکٹر شہباز قادری	کہاں گئے وہ دن	رشید راہل
وقائع اقبال	پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی	عصری تحریریں (تبصرے وتنقیدی مضامین) اول	دیپک بدکی
آداب صحافت	جان محمد آزاد و جاوید ماٹجی	عصری شعور (تبصرے وتنقیدی مضامین) دوم	دیپک بدکی
ایک زخم اور سہی	شبنم قیوم	نور شاہ کے تین ناولٹ	روف راحت
روح کا کرب (افسانے)	دیپک بدکی	خواب سراب گرداب	صوفی عبدالرشید

ISBN-978-93-80691-94-7

Meezan Publishers & Distributors
Opp. Fire & Emergency Services HQRS Batamaloo
Srinagar-190009 Kashmir
Ph.2470851 \ Fax 0194-2457215 \ Cell: 9419002212 / 8494002212
Email: meezanpublishers@gmail.com \ @rediffmail.com